Registered No. L. 5340

جلد ۳۳
عدد ۱-۲-۳

محرم
صفر
ربیع الاول
۱۳۶۹ھ

12-1/1949-1956

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ:

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۰۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے — برائے پاکستان — اس پرچہ کی قیمت ڈیڑھ روپیہ
" سات روپیہ آٹھ آنے — برائے ہندوستان — " دو روپے

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	-/۸
رسالہ دینیات	۱/۸
حقوق الزوجین	۱/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸
مسئلہ جبر و قدر	-/۱
تجدید و احیائے دین	-/۱
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	-/۱
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-
پردہ	۲/۸
تنقیحات	۲/۸
خطبات (نیا ایڈیشن)	-/۳
تفہیمات	۳/۸
حقیقت توحید	۱/۲
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/

اسلام اور ضبط ولادت	-/۱
سود	۲/۸
اشتراکیت اور نظام اسلام	۴/۸
نیا نظام تعلیم	-/۶/-
دین حق	-/۶/-
اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
ایک اہم استفتا	-/۳/-
دستور جماعت اسلامی	-/۳/-
روداد جماعت اسلامی حصہ اول	-/۱
روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۴
روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	[illegible]
روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	-/۲
روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
جماعت اسلامی کی دعوت، بذاؤ بگاڑ	فی -/۶/-
حقیقت شرک	-/۲

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	-/۱
اسلامی حکومت	-/۱
دین حق	-/۱
انسان کا معاشی مسئلہ	
اسلام اور جاہلیت	
شہادت حق	

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

۵ - الف ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ترجمان القرآن

فہرست مضامین

جلد ۳۳ | ماہ محرم، صفر، ربیع الاول ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۴۹ء تا جنوری ۱۹۵۰ء | عدد ۱، ۲، ۳

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِشارات

ترجمان القرآن جلد ۳۳، عدد ۵ میں جماعت اسلامی کی قوت کے نشو و ارتقا کے چند بنیادی لوازم کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ اسی سلسلے میں ایک دوسرا ضروری پہلو اس قابل نظر آتا ہے کہ اس پر بھی کچھ کہا جائے۔

جماعتی زندگی جہاں توسیع (Expansion) کی متقاضی ہوتی ہے، وہاں وہ استحکام (Consolidation) کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ اس کی ترقی کا تعلق اگر ایک طرف ارکان کی تعداد کے اضافے سے ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کی اصول و مقصد سے وابستگی اور ان کی سیرت کی مضبوطی سے بھی ہوتا ہے۔ جماعتوں کے لئے جتنا یہ امر تشویشناک ہو سکتا ہے کہ ان میں نئی بھرتی کی رفتار کم ہو جائے اس سے زیادہ یہ صورت حالات ان کے لئے خطرناک ہوتی ہے کہ ان کے افراد کا تعلق اصول و مقصد سے کمزور ہو رہا ہو، ان کی سیرتوں کا معیار پست ہونے لگے ان میں محرکات عمل کمزور ہونے لگیں یا ان میں نظم، سمع و طاعت کا احترام برقرار نہ رہے۔

متوسط درجے کے حالات میں اصولی جماعتوں کے ارباب امر (Leaders) اور ارکان کی رائے عام توسیع سے زیادہ استحکام کے پہلو پر متوجہ رہتی ہے لیکن جب جماعتی زندگی کسی ہمہ گیر کشمکش کے مرحلوں میں داخل ہوتی ہے تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جماعتیں کثرت تعداد کی ضرورت کو بشدت محسوس کرنے لگتی ہیں، اور اس حالت میں جہاں وہ غلطی کرتی ہیں کہ نئی بھرتی کے معاملے میں اپنا معیار گرا دیتی ہیں، وہاں وہ تطہیر (Purge) کے فرض کی ادائیگی میں تساہل کرنے لگتی ہیں۔ اس حالت میں بظاہر تو ایک جماعت یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ مسلسل بڑھ رہی ہے اور اس کا دائرۂ اثر دور دور تک پھیلا جا رہا ہے لیکن درحقیقت اس کی قوت گھٹ رہی ہوتی ہے وہ اپنے اندر ایک طرف جمود کو بار پانے کا موقع دیتی ہے اور دوسری طرف انتشار کے داخلے کے لئے دروازے کھول دیتی ہے۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ یا تو اس کی مجموعی قوت کا ایک بڑا حصہ اندر کے خلفشاروں کا مقابلہ کرنے اور جمود زدہ قوتوں کو اکسانے میں صرف ہوتا رہتا ہے یا پھر وہ داخلی مفسدات کے بارے میں آہستہ آہستہ لاپرواہی کا رویہ اختیار کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ

عمومی جماعت کی سطح سے گر کر محض ایک سیاسی جتھا یا مذہبی فرقہ بن جائے!

قوت محض تعداد افراد کا نام نہیں ہے ——— بلکہ افراد کی تعداد سے جو قوت ایک جماعت کے خزانے میں جمع ہوتی ہے اس کی مقدار کا انحصار افراد کی قوت ایمانی، ان کے اخلاق اور ان کی پابندیٔ نظم کی کیفیت پر ہوتا ہے چنانچہ قرآن کے اس دعویٰ کی تائید میں تاریخ انسانی کے ہزاروں تجربے پیش کئے جا سکتے ہیں کہ:

کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ	کتنی ہی ایسی قلیل التعداد جماعتیں ہیں جو کثیر التعداد جماعتوں پر غالب ہوئیں۔

یہی وہ نظریۂ قوت تھا جس کے مطابق قرون اولیٰ کی "جماعت اسلامی" کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ:-

ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مأتین وان یکن منکم مائۃ یغلبوا الفاً من الذین کفر!	تم میں سے اگر بیس صبر کیش (معرکہ آرا) ہوں تو وہ دو سو (دشمنوں) کو مغلوب کریں گے اور اگر تم میں سے سو ہوں تو وہ کفر کرنے والوں کے ہزار افراد پر غالب آجائیں گے!

یہ ایک حالت تھی جب کہ مسلمانوں کی تعداد کم تھی، اس کے بعد تعداد بڑھ گئی لیکن قوت کے اصل جوہر میں کمی آچکی تھی، لہٰذا جماعتی قوت کا معیار بدل گیا اور اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ:-

الئٰن خفف اللہ عنکم وعلم ان فیکم ضعفاً ط فان یکن منکم مائۃ صابرۃ یغلبوا مأتین ج وان یکن منکم الف یغلبوا الفین باذن اللہ	اب اللہ نے تم پر سے (ذمہ داریوں کا) بوجھ کم کر دیا اور اسے معلوم ہے کہ تم میں کمزوری آچکی ہے سو اب اگر تم میں سے ایک سو صبر کیش ہوں تو وہ دو سو کو شکست دے سکیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں تو وہ اللہ کے اذن سے دو ہزار (دشمنوں) پر غالب آجائیں گے!

درحقیقت جماعتی قوت کا فارمولا کچھ اس طرح کا ہے۔ تعداد افراد × ایمان × سیرت × پابندیٔ نظم۔

سرگرمیٔ عمل) :- جماعتی قوت :-

اس معاملے کے تحت کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک فرد ایک ہی فرد ہوتا ہے کبھی وہ دو کے برابر ہوتا ہے کبھی وہ پانچ اور دس کے مساوی قرار پاتا ہے اور بالکل اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے'، ایک فرد ایمان و اخلاق کی قوت کے لحاظ سے ایک معیاری فرد کے مقابلے ادھا' چوتھائی یا تہائی قرار پائے، بلکہ وہ اگر اور نیچے گیے تو پھر ایک مثبت درجہ رکھنے کے بجائے وہ کسی منفی درجے پر اتر سکتا ہے یعنی بجائے اس کے کہ اس کے وجود سے جماعتی قوت میں اضافہ ہو، الٹی کمی واقع ہونے لگے گی۔ بس جماعتی زندگی میں ناگزیر ہے کہ افراد کو صرف گنا ہی نہ جائے، بلکہ تولا بھی جائے، ورنہ محض کثرتِ تعداد اثاثہ (asset) ہی نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات ذمہ داری (Liability) بن جاتی ہے۔

غیر اصولی جماعتیں اس نظریۂ قوت کی زیادہ پروا نہیں کیا کرتیں، بلکہ وہ اپنی تمام تر توجہ کثرتِ تعداد پر مرتکز رکھتی ہیں خصوصیت سے اگر ان کو معرکہ آرائی کے کسی لمحے سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ اپنی "گنتی" کو بڑھانے یا کم سے کم جوں کا توں قائم رکھنے کی بڑی کوشش کرتی ہیں۔ وہ افراد کو خوش کرنے اور ساتھ لینے کے لئے ان سے ہر طرح کا سودا (Compromise) کر گذرتی ہیں!

لیکن اصولی جماعتیں تعداد پرستی کے فتنہ سے اپنے آپ کو بچانے کی پوری پوری کوشش کرتی ہیں —— بالخصوص جب ان کو کسی معرکے سے سابقہ پیش آجائے تو پھر وہ اور زیادہ توجہ سے اپنی "شاخ تراشی" کرتی ہیں اس لشکر کو آپ کیا احمقوں کی ٹولی نہ سمجھیں گے جو میدانِ جنگ کی طرف مارچ کرتے ہوئے محض اپنی کثرتِ تعداد کو برقرار رکھنے کے لئے سینکڑوں مریضوں، لولوں لنگڑوں اور نابیناؤں کو اپنے ساتھ لادے لئے جا رہا ہو، پھر اتنا ہی نہیں، مرنے والوں کے لاشے بھی تابوتوں میں بند سپاہیوں کے کندھوں پر رکھے ہوں، اور بھگوڑ قسم کے ساتھی بھی ہوں، بلکہ لشکر میں ایسے "جانبازوں" کے لئے بھی جگہ ہو جو آگے بڑھنے والوں کو پکڑ پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچ رہے ہوں اور جو ہر ہر قدم پر مختلف قسم کے اڑنگے لگانے میں سرگرم رہیں۔

کوئی اصولی جماعت میدانِ جد و جہد کی طرف بڑھتے ہوئے اس لشکر کی سی حماقت نہیں کر سکتی۔ وہ صرف یہی نہ دیکھے گی کہ سپاہیوں کی کتنی زیادہ سے زیادہ تعداد محاذ پر لے جا سکتی ہے بلکہ یہ بھی دیکھے گی کہ

کتنے افراد میں مقصد کے لئے جان لڑانے کا سچا جذبہ ہے۔ کتنے افراد کی صحت و توانائی قابلِ اعتماد ہے اور کتنے افراد میں ضبط و نظم کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت ہے۔

جماعتِ اسلامی کا قیام ایک بہت بڑے انقلابی مقصد کے لئے ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت نے اول روز سے توسیع سے بڑھ کر استحکام کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس کے سامنے صرف تعداد کا سوال نہیں رہا بلکہ ایمان و اخلاق کے معیار کی اہمیت پر بھی اس کی پوری توجہ قائم رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے دائرہ سے باہر کے مسلمانوں کے سے تمام تعلقات کو برقرار رکھنے کے باوجود رکنیت کے دروازے ان پر چوپٹ نہیں کھول دئے بلکہ عقیدہ و عمل کے بنیادی تقاضوں کے پورا کرنے کو داخلۂ رکنیت کے لئے لازم ٹھہرایا ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ جماعت اسلامی کے سامنے ایک بھاری کام ہے، جس کے متعلق امیر جماعت نے ۲۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

"آپ کی مٹھی بھر جماعت کو آئندہ پانچ سال میں ---- ایسے پانچ سال جو اسلام اور مسلمانوں اور خود آپ کے حق میں فیصلہ کن ہیں ---- بہت بڑا کام کرنا ہے۔ اتنا بڑا کام جو پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ آپ کو مسلمانوں کی رائے عام اور ان کے قومی رویّے کا رُخ بدلنا ہے، آپ کو عامۃ المسلمین کی اقتصادی، اخلاقی اور تمدنی اصلاح کرنی ہے، آپ کو مسلمانوں کے اہلِ دماغ طبقے میں نفوذ کرنا ہے اور اُسے ذہنی و عملی انتشار سے بچا کر اسلامی انقلاب کی راہ پر لگانا ہے۔"

اسی بھاری کام کے سلسلے میں اجتماع دربھنگہ (اکتوبر ۱۹۴۳ء) میں امیر جماعت نے یہ الفاظ فرمائے تھے کہ :-

"ہمارے پیشِ نظر صرف یہ نقشہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لئے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کرلی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کیریکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقے کے عوام کو سنبھال سکے، اس کی ذات عوام کا مرجع بن جائے۔

اور کسی مصنوعی کوشش کے بغیر بالکل فطری طریقہ سے عوام کی لیڈرشپ کا منصب اسے حاصل ہو جائے۔"

ایک بڑے نصب العین کے لئے صالح طریقۂ کار کے تحت کام کرنی والی جماعت کو رکنیت کے معیار کے بارے میں جتنا محتاط ہونا چاہیئے اس کے لئے جماعت کے پہلے ہی اجتماع میں کارکنوں کو متنبہ کر دیا گیا تھا اور پھر اس سلسلہ میں کئی بار پالیسی کی وضاحت ہوتی رہی حسب ذیل حوالے ملاحظہ ہوں:۔

(۱) "جماعت میں جب کوئی نیا شخص داخل ہو تو اسے پورا احساس ذمہ داری دلا کر ازسرِ نو کلمۂ شہادت ادا کرایا جائے ــــــ اس تجدید ایمان کے موقع پر ہر شخص کو متنبہ کر دیا جائے کہ یہ دراصل زندگی کے ایک نئے باب کا افتتاح ہے جو کچھ تم اب تک تھے وہ اب نہیں رہے آج سے تم ایک پابند نظام مومن کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کر رہے ہو آج سے تمہاری زندگی ایک بامقصد زندگی بن رہی ہے اور تم خدا اور مومنوں کو گواہ بنا رہے ہو کہ تمہاری تمام سعی و جہد اس مقصد کے لئے اس نظام کی پابندی میں صرف ہوگی۔"

(روداد اجتماع اوّل ص۲۰)

(۲) "جماعت کے ارکان کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ایک بہت بڑا دعوٰی لیکر بہت بڑے کام کے لئے اُٹھ رہے ہیں۔ اگر ان کی سیرتیں ان کے دعوٰی کی نسبت سے اس قدر پست ہوں کہ نمایاں طور پر ان کی پستی محسوس ہوتی ہو تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے دعوے کو مضحکہ بنا کر رکھ دیں گے۔ اس لئے ہر شخص کو جو اس جماعت میں داخل ہو اپنی دوہری ذمہ داری محسوس کرنی چاہیئے۔ خدا کے سامنے تو وہ بہرحال ذمہ دار ہے مگر خلق خدا کے سامنے بھی اس کی ذمہ داری سخت ہے جس بستی میں بھی آپ لوگ موجود ہوں وہاں کی عام آبادی سے آپکے اخلاق بلند تو ہونے چاہئیں بلکہ آپ کو بلندیٔ اخلاق، پاکیزگیٔ سیرت، اور دیانت و امانت میں ضرب المثل بن جانا چاہیئے۔ آپ کی ایک معمولی لغزش نہ صرف جماعت کے دامن پر بلکہ اسلام کے دامن پر دھبہ لگائیگی اور آپ بہت سے لوگوں کے لئے سبب گمراہی بن جائیں گے۔"

(روداد اجتماع اوّل ص۲۹)

(۳) "ہم کسی شخص کو اس معرض میں نہیں لیتے کہ وہ مسلمان ہوگا" بلکہ جب وہ کلمہ طیبہ کے معنی و مفہوم اور

مقتضیات کو جان کر اُس پر ایمان لانے کا اقرار کرتا ہے، تب اسے جماعت میں لیتے ہیں، اور جماعت میں آنے کے بعد اُس کے جماعت میں رہنے کے لئے اس بات کو شرط لازم قرار دیتے ہیں کہ اسلام میں جو کم سے کم مقتضیات ایمان ہیں ان کو پورا کرے۔ اس طرح ان شاء اللہ قوم میں سے صرف صالح عنصر چھٹ کر جماعت میں آئے گا، اور جو جو صالح بنتا جائے گا اس جماعت میں داخل ہوتا جائے گا۔"

(روداد اجتماع اوّل ص ۸)

(۳) "ارکانِ جماعت کی تعداد میں اضافہ کرنے کی خاطر خام یا نیم پختہ آدمیوں کی بھرتی نہ کی جائے بلکہ صرف ان لوگوں کو جماعت میں داخل کیا جائے جو جماعت کے مسلک کو اچھی طرح سمجھ چکے ہوں، جن کے خیالات میں پراگندگی باقی نہ رہی ہو، اور جنہوں نے دستورِ جماعت کی ذمہ داریوں کو بھی سمجھ لیا ہو ۔۔۔ عام طور پر لوگوں کو شرکتِ جماعت کی دعوت[1] نہ دی جائے بلکہ اس عقیدے اور نصب العین کی تبلیغ کی جائے جس پر جماعت قائم ہوئی ہے، پھر ان میں سے جو لوگ اس حد تک متاثر ہو جائیں کہ ان کی زندگی میں عملاً تبدیلی ہونی شروع ہو جائے، اور وہ خود جستجو کرنے لگیں کہ اس نصب العین کے لئے کام کرنے کا راستہ کیا ہے، تب ان کے سامنے جماعت کا دستور پیش کیا جائے اور دستور کو دیکھ کر جب وہ جماعت میں شریک ہونے کی خود خواہش کریں تب بھی انہیں فوراً داخل جماعت نہ کر لیا جائے، بلکہ انہیں بار بار سوچنے کا موقع دیا جائے، اور جب وہ خوب سوچ سمجھ کر شرکتِ جماعت کا فیصلہ کر لیں تو ادائے شہادت کی ذمہ داریاں پوری طرح محسوس کرا کے ان سے شہادت ادا کرائی جائے۔"

(روداد مجلس شوریٰ محرم ۱۳۶۱ھ)

بحمد اللہ کہ معیارِ رکنیت کی اہمیت کا یہ احساس جماعت میں پوری طرح برقرار ہے، اور تحریک کے عوامی میدان میں داخل ہونے کے بعد جب کبھی اس مسئلے پر جماعت کے ذمہ دار کارکنوں نے غور کیا تو وہ ہمیشہ اسی نتیجے پر پہنچے کہ رکنیت کے معیار کو کسی طرح بھی گرایا نہیں جا سکتا۔

استحکامِ جماعت کا دوسرا تقاضا تربیت و تزکیہ ہے۔ تربیت و تزکیہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک جماعت کے حلقے میں جو لوگ

[1] اپریل ۱۹۴۵ء میں جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے مشورے سے امیر جماعت نے اس پالیسی میں ترمیم کر دی۔ اب براہ راست جماعت کی شرکت کی دعوت بھی دی جاتی ہے لیکن رکنیت کے معیار کو برقرار رکھنے کے لئے بھرتی میں حسب سابق پوری احتیاط برتی جاتی ہے۔

داخل ہوں، ان کے عقائد خیالات، جذبات، زاویہ نگاہ، بنیادی اخلاق، اجتماعی سیرت اور سیاسی طرز عمل کی اصلاح اس اصول و مقصد کے مطابق کرنے کا انتظام ہو جسے لے کر کوئی جماعت کھڑی ہوئی ہے۔

استحکام کے اس تقاضے کو بھی جماعت اسلامی نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں لٹریچر کے ذریعے دین کا صحیح علم اور وقتی مسائل کے متعلق اسلامی بصیرت سے کام لینے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوششیں برابر جاری رہی ہیں۔ علاوہ بریں جماعت کے مقامی، حلقہ وار اور ملکی اجتماعات میں بھی ہمیشہ کارکنان جماعت کی ذہنی و عملی تربیت کیلئے اسباب بہم پہنچانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پھر اسی تربیت و تزکیہ کے لئے جہاں جماعت کے اُمراء پر خاص ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں، وہاں ہر رکن میں اپنے دوسرے رفقا کی اصلاح و خیر خواہی کا ایک عمومی جذبہ پیدا کرنے کیلئے ضروری تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔

اسی تربیت و تزکیہ کے لئے مختلف اوقات میں تربیت گاہوں کا قیام عمل میں آتا رہا ہے، اور آئندہ بھی تربیت گاہوں کو قائم کئے بغیر کام نہیں چلایا جا سکتا۔

اس کے بعد استحکام کے تیسرے تقاضے کا نمبر آتا ہے، جو بظاہر بہت ہی ناخوش گوار فرض ہے! ——

—— یعنی تطہیرِ جماعت!

تطہیرِ جماعت کے معنی یہ ہیں کہ ایک اصولی جماعت جب اپنے کارکنوں میں سے کسی کے متعلق اس بات کا یقین کرنے کے لئے کھلے شواھد پاتی ہے کہ اس میں بنیادی نظریہ و مقصد سے وابستگی باقی نہیں رہی، یا اسے طریق کار سے اصولی اختلاف ہے، یا اس کا کیرکٹر مطلوبہ معیار کی کم سے کم حد سے بھی گر رہا ہے، یا وہ نظم و ضبط کے تقاضوں کو پورا کرنے سے گریز کر رہا ہے، اور ان وجوہ میں سے کوئی ایک یا چند ایسی ہیں کہ اس کا جماعت میں رہنا جماعت کی تقویت کا ذریعہ بننے کے بجائے اس کیلئے موجبِ نقصان ہوگا، تو وہ اوّل تو اس کی اصلاح کی کوششیں کرتی ہے، ورنہ بالآخر اسے اپنے دائرے سے خارج کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

ایک جماعت کا عمل تطہیر گویا ایک جسم کے آپریشن کی حیثیت رکھتا ہے اور آپریشن کرنے سے بہرحال کچھ نہ کچھ درد ہوتا ہے کچھ نہ کچھ خون بہتا ہے، کوئی نہ کوئی حصہ بدن کٹتا ہے چنانچہ جس طرح عام زندگی میں ایک مریض فرد

حتی الوسع آپریشن کو ٹالنا چاہتا ہے، اسی طرح جماعتیں بھی اپنے لئے آپریشن کا عمل بخوشی گوارا نہیں کرتیں، بلکہ اسے ٹالنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن اس ناگزیر فرض کی ادائی میں ٹال مٹول کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ مرض کا زہر ایک عضو سے دوسرے اعضا تک پھیلتا رہے اور جسم کی قوت اس کی مدافعت میں ضائع ہوتی رہے۔

لیکن جماعتِ اسلامی کا آغاز کرتے وقت ہی استحکام کے اس تقاضے کی اہمیت کارکنانِ جماعتِ اسلامی کے پیشِ نظر تھی، اور ناسازگاری اتفاق یہ کہ ابتدائی مراحل ہی میں عملِ تطہیر سے جماعت کو دوچار ہونا پڑا، چنانچہ اجلاس شوریٰ شوال ۱۳۶۱ھ (بمقام دہلی) میں طے شدہ امور میں سے ایک یہ تھا کہ:۔

"جماعت کے نظام میں احتیاط کی کوششوں کے باوجود ایک معتد بہ تعداد ایسے لوگوں کی داخل ہوگئی ہے جن کی ذہنی، اخلاقی و دینی حالت اس جماعت کی رکنیت کیلئے کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ ایسے ارکان کی اصلاحِ خیال و اصلاحِ حال کے لئے ایک مناسب مدت (جس کا تعین ہر شخص کی حالت کے لحاظ سے علیٰحدہ ہوسکتا ہے) مقرر کی جائے اور اگر اصلاح نہ ہوسکے تو ان سے درخواست کی جائے کہ اس وقت تک نظامِ جماعت سے باہر رہیں جب تک وہ کم از کم اس معیار پر نہ پہنچ جائیں جو اس جماعت کی رکنیت کے لئے مطلوب ہے۔"

(رودادِ جماعتِ اسلامی حصہ اول)

پھر دوبارہ اجتماع دربھنگہ، اکتوبر ۱۹۴۳ء میں امیرِ جماعت نے دوبارہ جماعت کو عملِ تطہیر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ ہدایت دی کہ:۔

"جو لوگ تحریک کو اچھی طرح سمجھے بغیر جماعت میں آگئے ہیں اور جن کے اندر کوئی نمایاں اخلاقی تبدیلی نہیں پائی جاتی ان کو پختہ کرنے کی کوشش کی جائے، اور پھر بھی جن کے اندر خامی رہ گئی ہو ان سے درخواست کی جائے کہ نظامِ جماعت سے باہر رہ کر ہر ممکن طریق سے ہمارے ساتھ تعاون کریں۔"

(رودادِ جماعتِ اسلامی حصہ اول)

ان ہدایات کے مطابق مختلف مواقع پر جماعت سے اصلاح پذیر نہ ہوسکنے والے افراد کا اخراج عمل میں آتا رہا ہے۔ اکثر تو ایسا ہوا ہے کہ جماعت کے ساتھ نہ چلنے والے ان افراد نے جو رکنیت کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو کوتاہ پاتے تھے خود آگے بڑھ کر درخواست پیش کردی ہے کہ ان کو ارکان کی صف سے نکال کر ہمدردوں کی صف میں منتقل کردیا جائے لیکن کبھی کبھی جماعت خود بھی بعض کارکنوں کا اخراج عمل

میں لانے پر مجبور ہوتی رہی ہے۔ اس قسم کی چھانٹی سے جماعت کی قوت میں کبھی کمی نہیں آئی بلکہ ہمیشہ اس کی رفتارِ کار میں اس سے اضافہ ہوا ہے۔

یہ مرحلۂ کشمکش جس میں سے جماعت اب گذر رہی ہے، اس کا آغاز کرتے ہوئے امیر جماعت سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی (حالِ اسیرِ پاکستان) نے مجلسِ شوریٰ کے مشوروں کی روشنی میں ایک دفعہ پھر جماعت کو فریضۂ تطہیر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ ہدایات دی تھیں کہ:-

> "اسلامی نصب العین کے لئے جو جدوجہد اب جماعت کے پیشِ نظر ہے اس کی اہمیت اور نزاکت کو دیکھتے ہوئے اب یہ ضروری ہے کہ ارکانِ جماعت کا معیارِ اخلاق و دیانت پہلے سے بھی زیادہ بلند ہو۔ اور ان کے اندر جماعتی نظم و ضبط کے لحاظ سے کوئی خامی باقی نہ رہے۔ اس لئے امرائے حلقہ اور قیمانِ حلقہ کا فرض ہے کہ ان دونوں حیثیتوں سے اپنے اپنے حلقوں کی جماعتوں اور منفرد ارکان کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کی کوشش کریں۔ نئے ارکان کی بھرتی میں بھی پہلے سے زیادہ چھان بین کی کوشش کریں اور سابقہ ارکان میں بھی اگر کچھ نامناسب لوگ موجود ہوں تو ان کو درست کرنے یا چھانٹ دینے کی کوشش کریں۔"

یہ ہدایت جس موقع پر دی گئی تھی، یہ وہ موقع تھا جبکہ تحریک عوامی میدان میں داخل ہو رہی تھی اور اس میدان میں آنے کے بعد جس طرح کی کشمکش کا سامنا کرنے کے امکانات تھے ان کے پیشِ نظر یہ ممکن تھا کہ جماعت کی توجہ "کثرتِ تعداد" پر زیادہ منعطف ہو جائے۔ اس خطرے سے جماعت کو بچانے کے لئے اُسے خاص طور پر بروقت متنبہ کر دیا گیا تھا"

ہمیں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ کشمکش سے دوچار ہو جانے کے بعد بھی ارکانِ جماعت میں ایسے افراد شاذ ہی کہیں پائے گئے ہیں جنہیں کاٹ پھینکنے پر جماعت مجبور ہو گئی ہو لیکن اس کے باوجود جماعت کو اپنی "صحت و قوت" کو برقرار رکھنے کے لئے پہلے سے بھی زیادہ چوکنّا رہنا چاہیئے —— کیونکہ ہو سکتا ہے کہ آگے آنے والی منزلیں طے کردہ منزلوں سے زیادہ کٹھن ہوں اور ایمان و اخلاق کی کمزوریوں کو ساتھ لے کر ان کو عبور نہ کیا جا سکے! —— اگرچہ اللہ سے ہماری عاجزانہ درخواست یہی ہے کہ وہ

آئندہ مراحل کو ہمارے لئے سہل تر بنائے اور ہماری کوتاہیوں اور کمزوریوں سے درگذر فرمائے!

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات ایک بار پھر اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم جس کام کو کرنے اٹھے ہیں، وہ ایک ایسا مقدس کام ہے جسے ہمیشہ خدا کے چنے ہوئے خاص بندوں نے سرانجام دیا ہے ہم ان مقدس ہستیوں کے مقابلہ میں ہزار درجے فروتر ہیں لیکن کرنے کا کام چونکہ یہی ہے اور اسے کرنے کا ہم نے تہیہ کرلیا ہے، لہٰذا ہر لحظہ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم اس کام کی شان کے مطابق ایمان و اخلاق کا ایک خاص معیار قائم کریں اور اسے قائم رکھیں۔

لیکن جماعت نے رکنیت کے لئے جو ادنیٰ ترین معیار مقرر کیا ہے، اگر کوئی رکن محسوس کرے کہ وہ اس معیار سے گر رہا ہے اور وہ اس پر قائم رہنے کی ہمت نہیں پاتا تو جماعت اور اس کے نصب العین پر اس کا یہ بہت بڑا احسان ہوگا کہ وہ رکنیت کے مقام سے ہٹ کر ہمدردوں کی صف میں منتقل ہو جائے اسی طرح اگر ارکانِ جماعت اور بالخصوص امرائے جماعت کہیں کسی فرد کو معیارِ رکنیت سے گرتا ہوا پائیں تو اول تو اس کی اصلاح کی اور اس کو سہارا دینے کی کوشش کریں لیکن اگر وہ یہ محسوس کریں کہ ایک فرد رکنیت کے تقاضے پورے کرنے کے قابل نہیں رہا تو پھر تطہیرِ جماعت کے فرض کی ادائی میں ہرگز تساہل نہ کریں۔

اب جماعت جس مرحلے سے گذر رہی ہے، اس میں اگر اصلاح و تطہیر کے دوگونہ فرض سے غفلت کی جائے تو نہیں کہا جا سکتا کہ کس نازک گھڑی میں کہاں سے کون مفسدہ سر اٹھا کے سامنے آکھڑا ہو۔ ایک ایسی طاقت جو عقائدِ الٰہی کے بجائے غیر اسلامی اصولوں کو چیلنج کر رہی ہو، ایک ایسی طاقت جو فسق و فجور سے تصادم کا آغاز کرچکی ہو، اس کے حلقے کے اندر کا ایک فرد بھی اگر کہیں اسلامی اصولوں پر ایمانِ کامل کا ثبوت دینے میں کوتاہی کرے، امانت داری کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کمزوری دکھائے، فسق و فجور کی روش پر ایک قدم بھی دانستہ حرکت کرے تو ایسے ایک فرد کی بظاہر چھوٹی سی حرکت جماعت کی جدوجہد کو بہت بڑی حد تک کمزور کرسکتی ہے۔ ہم گھر سے باہر جن چیزوں کے خلاف لڑنے جا رہے ہیں وہ کسی وقت اگر خدانخواستہ خود ہمارے گھر میں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں نمودار ہوں تو پھر ہمیں باہر کی جنگ بند

کرکے خود اپنے گھر میں لڑائی لڑنی پڑ جائے گی۔ دوسری جماعتیں ہزار گنا ذہنی انتشار کے باوجود جی سکتی ہیں۔ وہ اپنے ارکان کی کھلی کھلی خیانتوں اور بدمعاملگیوں کو گوارا کرسکتی ہیں، وہ ان کی پستیٔ اخلاق کے مظاہروں سے چشم پوشی کرسکتی ہیں، وہ اسلامی حیاداری کے خلاف ان کی گوناں گوں حرکات کو ہضم کرسکتی ہیں، وہ تنظیم کی رسمی پابندی کے ساتھ بدنظمی کے سارے نمونوں کو ساتھ لے کے چل سکتی ہیں لیکن اسلام کے صحیح نصب العین کے لئے کام کرنے والی جماعت کا مزاج اتنا لطیف ہوتا ہے کہ بے اصولے پن اور پستیٔ اخلاق کے ذرا سے تکدر کو بھی گوارا نہیں کرتا۔

یقین جانئے کہ اگر ہم سے کسی ایک فرد سے بے اصولے پن کا ظہور ہو تو جماعت کی قوت کو اس سے بہرحال دھکا لگے گا، اگر ہم سے کسی فرد کی طرف سے خیانت کاری اور بدمعاملگی کی کوئی ایک ادنیٰ مثال بھی سامنے آئے تو وہ ہماری کامیابی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے، اگر ہم میں سے کسی فرد کی طرف سے نصب العین کی وفاداری میں کوئی کمی ظاہر ہو تو ہمارا بڑھتا ہوا قدم اس کی وجہ سے رک سکتا ہے، اگر ہم میں سے کسی ایک فرد کی طرف سے سمع و طاعت کے اسلامی ضوابط کی دانستہ خلاف ورزی کا قصور سرزد ہو جائے تو اس سے جماعت کی مجموعی سرگرمی مجروح ہوئے بغیر نہ رہے گی۔

پس ناگزیر ہے کہ جہاں ہم باہم دگر ایک دوسرے کی خیرخواہی اور اصلاح میں صدقدلی سے ممد و معاون ہوں، وہاں ہم ایسے مفاسد کے ظہور کو روکنے کے لئے مستعد سنتری بن کے بھی کھڑے ہوں جن سے جماعت کی جدوجہد پر براہِ راست یا بالواسطہ برا اثر پڑ سکتا ہے، اور اسی سلسلے میں اگر کہیں آخری قدم اٹھانے کی ضرورت پیش آ ہی جائے تو ہم اس کے لئے اپنے اندر پوری آمادگی کا جذبہ برسرکار رکھیں۔

یہ حقیقت البتہ ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ "اخراج" انتہائی تکلیف دہ اور آخری چارۂ کار ہے جو اصلاح کی ساری کوششوں کے ناکام ہو جانے پر کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ کسی شخص کو رکنیت جماعت سے الگ کرنے کے بارے میں جماعت کی پالیسی ہمیشہ نہایت محتاط رہی ہے اور اس معاملے (باقی بر صفحہ ۸۶)

مقالات

سود میں نئے مباحث کا اضافہ

(مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی)

(۴)

اشتراکیت کا ردِ عمل

روس میں اشتراکیت نے اپنا نظام قائم کرنے کے لئے جتنے بڑے پیمانے پر، جیسے سخت ہولناک ظلم کیئے، اور پھر اس انقلاب کی کامیابی نے دنیا کے ہر ملک میں طبقاتی جنگ کی سلگتی ہوئی آگ پر جو تیل چھڑکا، اس نے تمام غیر اشتراکی ممالک کے اہل فکر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ بے قید معیشت کے اصولوں اور طریقوں میں کیا ترمیم کریں جس سے محنت پیشہ طبقوں کی شکایات رفع ہوں اور ان کا ملک اشتراکی انقلاب کے خطرے میں پڑنے سے بچ جائے۔ اگرچہ بے قید معیشت کی برائیاں اسی وقت سے نمایاں ہونی شروع ہو گئی تھیں جب سے جدید سرمایہ داری کا نظام قائم ہوا۔ اس پر تنقید برابر ہوتی رہی۔ اس میں سطحی اور جزوی اصلاحات بھی کچھ نہ کچھ ہوتی رہیں۔ لیکن تغیر، ترمیم اور اصلاح کی ضرورت کا حقیقی احساس روسی اشتراکیت کے عمل، اثرات اور نتائج کو دیکھ کر ہی پیدا ہوا، اور اس ردِ عمل نے نظام سرمایہ داری کے دو بڑے بڑے علاقوں میں دو مختلف صورتیں اختیار کیں۔

جن قوموں کے نظام زندگی کو جنگ عظیم اول نے بری طرح درہم برہم کر دیا تھا، اور جنہیں اشتراکیت کی بھڑکائی ہوئی طبقاتی جنگ سے کامل تباہی کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا، اور جن کی سرزمین میں جمہوریت کی جڑیں کچھ مضبوط بھی نہ تھیں، ان کے ہاں فاشزم اور نازی ازم نے جنم لیا۔

جن قوموں میں جمہوریت مضبوط بنیادوں پر قائم تھی اور جن کے نظام زندگی میں جنگ نے کچھ بہت زیادہ خلل بھی نہیں ڈالا تھا انھوں نے اپنی پرانی وسیع المشرب جمہوری سرمایہ داری کو اسکی فطری بنیادوں پر قائم رکھتے ہوئے صرف اسکی بے قیدی میں ایسی اصلاحات کرنے کی کوشش کی جس سے اس کے نقصانات

دُور ہو جائیں۔

فاشزم اور نازی ازم اشتراکی حضرات بالعموم ان دونوں مسلکوں کو سرمایہ داری کی رجعت قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور الزام رکھتے ہیں کہ بورژوا سرمایہ داروں نے اپنی بازی ہرتی دیکھ کر ہٹلر اور مسولینی کو کھڑا کر دیا تھا۔ لیکن یہ اصل حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ کسی طبقے یا کسی مخصوص مفاد کے بدنیت ایجنٹ نہیں تھے مارکس اور لینن ہی کی طرح کے لوگ تھے۔ ویسے ہی مخلص، ویسے ہی ذہین، اور ویسے ہی کج فہم۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف جنگ کی زبردست چوٹ نے ان کی قوم کو اس قدر بدحال کر دیا ہے کہ صدیوں کا قومی فخر و ناز خاک میں ملا جاتا ہے۔ دوسری طرف بے قید معیشت کی اندرونی خرابیاں اور اشتراکیت کی اوپری انگیخت قوم کے مختلف عناصر کو آپس ہی میں ایک سخت خونریز اور غارت گر کشمکش میں مبتلا کیے دے رہی ہیں۔ اس لیے انہوں نے ایسی تدبیریں سوچنی شروع کیں جن سے وہ طبقاتی اغراض کی اندرونی نزاع کو دور کر کے اپنی قومی وحدت کو پارہ پارہ ہونے سے بھی بچا لیں اور اپنی قوم کی معاشی، تمدنی اور سیاسی طاقت کو مضبوط کر کے از سرِ نو اس کی عظمت کا سکہ بھی دنیا میں بٹھا دیں لیکن وہ اور ان کے حامی اور پیرو، سب کے سب مغربی ذہن کی اُن ساری کمزوریوں کے وارث تھے جنہیں ہم تاریخ میں مسلسل کارفرما دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ اپنے پیش رو مفکرین و مدبرین کی طرح انہوں نے بھی یہی کیا کہ چند صداقتوں کو لے کر ان کے اندر بہت سے مبالغے کی آمیزش کی، چند صداقتوں کو ساقط کر کے ان کی جگہ چند حماقتیں رکھ دیں، اور اس ترکیب سے ایک نیا غیر متوازن نظامِ زندگی لا کھڑا کیا۔

آیئے اب ذرا اس مرکب کا بھی جائزہ لے کر دیکھیں کہ اس میں صحیح اور غلط کی آمیزش کس طرح کس تناسب سے تھی اور اس کے نفع و نقصان کی میزان کیا رہی۔ اگرچہ جنگِ عظیم دوم میں شکست کھا کر یہ دونوں توأم بھائی بظاہر مر چکے ہیں، لیکن ان کی پھیلائی ہوئی بہت سی بدعتیں بدلے ہوئے ناموں سے مختلف ملکوں میں اب بھی موجود ہیں اور خود ہمارا ملک بھی ان بلاؤں سے محفوظ نہیں ہے۔ اس لیے فاشیّت اور نازیّت کے اجزاء صالح اور اجزاءِ فاسد کی نشان دہی اب بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی جنگ سے پہلے تھی۔

صحیح اور مفید کام فاشی اور نازی حضرات اشتراکیوں کے اس خیال کو رد کرنے میں بالکل حق بجانب تھے کہ ایک معاشرے اور ایک قوم کے زمیندار و سرمایہ دار طبقات اور محنت پیشہ طبقات کے درمیان صحیح اور فطری

تعلق صرف نفرت، عناد اور جنگ ہی کا تعلق ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ اصل چیز طبقہ نہیں بلکہ معاشرہ اور قوم ہے جس کے مختلف اجزا و اعضاء اپنے مجموعہ کے لئے مختلف خدمات انجام دیتے ہیں۔ ان کے درمیان حقیقی تعلق، دشمنی اور جنگ اور پیکار کا نہیں بلکہ موافقت اور تعاون اور تعامل کا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ سب مل کر سب کے لئے اشیاء ضرورت پیدا کریں اور اجتماعی پیداوار کو بڑھا کر قومی دولت اور طاقت میں اضافہ کریں۔ اس موافقت اور تعاون میں اگر کوئی کمی یا خلل ہو تو اسے دور ہونا چاہیئے۔ نزاع و اختلاف ہو تو اسے رفع ہونا چاہیئے نہ یہ کہ وہ بڑھے اور ایک ہی معاشرے کے اجزاء ایک دوسرے کو فنا کر دینے پر تل جائیں۔

انہوں نے اشتراکیت کے اس نظریہ کو بھی بجا طور پر رد کر دیا کہ اجتماعی مفاد کے لئے انفرادی ملکیت اور ذاتی نفع طلبی بجائے خود کوئی نقصان دہ چیز ہے جسے ختم ہو جانا چاہیئے۔ ان کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ یہ دونوں چیزیں خود اجتماعی مفاد ہی کے لئے مفید اور ضروری ہیں، بشرطیکہ یہ بے قید معیشت کی طرح غیر محدود نہ ہوں بلکہ کچھ حدود کے ساتھ محدود کر دی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ افراد کو اپنے نفع کے لئے جدوجہد کرنے کا حق تو ضرور رہے مگر اس حق کا استعمال اجتماعی مفاد کے تحت اور اس کے مطابق ہونا چاہیئے نہ کہ اس کے خلاف۔ مرکزی مالیات High Finance، معدنیات، جہاز سازی و جہاز رانی، سامان جنگ کی صنعت اور ایسے ہی دوسرے بڑے کاروبار Big Business انفرادی ملکیت میں نہ رہنے چاہئیں۔ ایسے اجاروں کو بھی ختم ہونا چاہیئے جن میں اجتماعی مفاد کو شخصی مفاد پر قربان کیا گیا ہو۔ تجارت میں سے سٹے کو قطعی بند ہونا چاہیئے۔ قرض و استقراض کے نظام میں سے سود کو بالکل ساقط ہو جانا چاہیئے[1]۔ اور کاروبار کو ایسے قواعد و ضوابط کا پابند ہونا چاہیئے جو اس سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کے مفاد سے مطابقت رکھتے ہوں نہ کہ صرف ایک گروہ کے مفاد سے۔ اس کے بعد اگر ایک کارخانہ دار قیمتیں مناسب رکھتا ہے، مال اچھا تیار کرتا ہے، اپنے مزدوروں کو خوشحال اور خوشدل رکھتا ہے، اپنی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اور اپنی ان خدمات کے معاوضے میں جائز حدود کے اندر رہ کر منافع لیتا ہے تو وہ آخر کس جرم کا مرتکب ہے کہ خواہ

[1] اگرچہ یہ لوگ سود کو عملاً بند نہ کر سکے، اور خود اسٹیٹ نے قرض لے کر اس پر سود ادا کیا، لیکن نازی اور فاشسٹ، دونوں، سود کو برا جانتے تھے اور اسے بند کرنے کے قائل تھے۔

مخواہ اسے دشمن جماعت قرار دیا جائے؟

انہوں نے پرانی وسیع المشربی کے اس نظریہ کو بھی بالکل بجا طور پر رد کر دیا کہ حکومت صرف پولیس اور عدالت کے فرائض انجام دے اور معاشی زندگی کے کاروبار سے کچھ غرض نہ رکھے۔ انہوں نے کہا کہ قومی معیشت کے مختلف عناصر کے درمیان ہم آہنگی اور توافق اور تعاون پیدا کرنا اور نزاع و کشمکش کے اسباب کو دور کرنا قومی ریاست کے فرائض میں سے ہے۔ انہوں نے ایک طرف ہڑتال کو اور دوسری طرف کارخانے بند کرنے کو ازروئے قانون ممنوع ٹھہرایا۔ اجیروں اور متاجروں کی مشترک کونسلیں بنائیں۔ ان کے درمیان حقوق و فرائض انصاف کے ساتھ مقرر کرنے کی کوشش کی۔ اور ان کے جھگڑوں کو چکانے کے لئے باہمی گفت و شنید پھر پنچایت اور بالآخر عدالتی فیصلہ کا ایک باقاعدہ نظام مقرر کر دیا۔

انہوں نے سرمایہ داری نظام کی اس خرابی کو دور کرنے کی بھی کوشش کی کہ جو لوگ بیکار ہوتے ہیں یا ناکارہ ہو جاتے ہیں ان کی خبر گیری کا کوئی ذمہ دار نہیں ہوتا۔ اس طرح بے وسیلہ لوگوں کو بے سہارا چھوڑ دینے کے جو نقصانات ہو سکتے ہیں نازیوں اور فاشیوں نے ان کو محسوس کیا اور بہت وسیع پیمانے پر سوشل انشورنس کا اہتمام کیا جس کے ذریعہ سے بیماری، بڑھاپے، بیکاری، اور حادثات کی صورت میں کارکنوں کو مدد دی جاتی تھی۔ نیز انہوں نے ماؤں اور بچوں کی نگہداشت، فلاح اطفال، اپاہجوں اور معذوروں کی خبر گیری، جنگ میں ناکارہ ہو جانے والوں کی امداد، لاوارث بوڑھوں کی دیکھ بھال اور ایسے ہی دوسرے امور خیریہ کے لئے عظیم الشان ادارے قائم کئے۔ جنگ سے پہلے جرمنی میں اس طرح کا جو ادارہ قائم تھا اس نے تقریباً ۵ لاکھ افراد کو سنبھال رکھا تھا۔

انہوں نے بے قید معیشت کے اس عیب کو دور کرنے کی طرف بھی توجہ کی کہ سارا معاشی کاروبار بغیر کسی نقشے اور منصوبے اور ہم آہنگی کے چلتا رہتا ہے اور اس کی وجہ سے معاشی وسائل پوری طرح سے استعمال بھی نہیں ہوتے اور جتنے کچھ استعمال ہوتے ہیں ان میں توازن نہیں ہوتا۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لئے انہوں نے قومی معیشت کی رہنمائی اور تنظیم و توفیق Co-ordination م اسٹیٹ کے ہاتھ میں لیا، معاشی زندگی کے تمام شعبوں کی کونسلیں بنائیں، اور ایک منضبط اور منظم طریقے سے پیداوار کے وسائل اور قوتوں کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح انہوں نے بے روزگاری کا خاتمہ کر دیا[1]، پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ کیا، اور مختلف

[1] ۱۹۳۲ء میں جب نازی پارٹی برسر اقتدار آئی تھی تو جرمنی میں تقریباً ۸۰ لاکھ آدمی بیکار تھے۔ مگر چند سال بعد نوبت یہ آگئی کہ جرمنی کو کارکنوں کی کمی کا شکوہ تھا۔

شعبوں میں ہموار ترقی کی۔

حماقتیں اور نقصانات | یہ تھیں فاشیت اور نازیت کی برکات۔ مگر ان برکات کے لیئے اٹلی اور جرمنی کو قیمت کیا دینی پڑی؟

نازی اور فاشی حضرات نے طبقاتی منافرت کے افتراق انگیز اثرات کا مداوا قوم پرستی کی شراب سے، نسلی فخر و غرور کے جنون سے، دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور غیظ و غضب کے اشتعال سے، اور عالمگیری و جہاں کشائی کے جذبات سے کیا جس کا انجام کبھی کسی قوم کے حق میں بھی اچھا نہیں ہوا ہے۔ قوموں کا صحیح نشو و نما اور اٹھان اگر ہو سکتا ہے تو صرف تعمیری اخلاقیات اور ایک صالح نصب العین ہی کے بل پر ہو سکتا ہے۔ جو لیڈر اس طریقہ کو چھوڑ کر قومیت کے استحکام و ترقی کے لیئے نفرت اور خطرے اور اشتعال ہی کو مستقل وسائل کے طور پر استعمال کرنے لگتے ہیں وہ اپنی قوم کا مزاج بگاڑ دیتے ہیں اور ایسے ذرائع سے اٹھی ہوئی قوم ایک نہ ایک دن بری طرح ٹھوکر کھا کر گرتی ہے۔

انہوں نے اپنی قوم کی بھلائی کے لیئے معاشی و تمدنی اصلاح کا جو پروگرام بنایا اسکو سیدھے سیدھے معقول طریقے سے نافذ کرنے کے بجائے ایک نہایت لغو اجتماعی و سیاسی فلسفہ گھڑا جو بے شمار مبالغہ آفرینیوں اور عملی حماقتوں کا مرکب تھا۔ انہوں نے پہلے یہ مقدمہ قائم کیا کہ "فرد قائم ربط ملت سے ہے ورنہ کچھ نہیں"۔ پھر اس پر یہ ردا چڑھایا کہ ربطِ ملت میں جو فرد شامل نہیں ہوتا یا اس ربط کے قیام میں مانع ہوتا ہے اسے واقعی کچھ نہ رہنا چاہیئے۔ اس کے بعد استدلال کی عمارت یوں کھڑی کی کہ ربطِ ملت کا اصل مظہر ہے قومی ریاست، اور قومی ریاست کے ضبط و استحکام کا انحصار ہے اُس پارٹی پر جو قومی وحدت اور ترقی کا یہ پروگرام لے کر اٹھی ہے، لہٰذا "جرمن ہے تو نازی پارٹی میں آ" اور "اٹالین ہے تو فاشست ہو جا"۔ اس طرح قوم اور ریاست، اور حکومت اور حکمراں پارٹی کو ایک ہی چیز بنا ڈالا گیا۔ ہر اس شخص کو قوم اور قومی ریاست کا دشمن قرار دیا گیا جس نے برسر اقتدار پارٹی سے کسی معاملہ میں اختلاف کی جرأت کی۔ تنقید اور بحث اور آزادیٔ رائے کو ایک خطرناک چیز بنا دیا گیا۔ ایک پارٹی کے سوا ملک میں کوئی دوسری پارٹی زندہ نہ رہنے دی گئی۔ انتخابات محض ایک کھیل بن کر رہ گئے۔ قوم کے دماغ پر ہر طرف سے مکمل احاطہ کرنے کے لیئے پریس، ریڈیو، درس گاہ، آرٹ

لٹریچر اور تھیٹر کو بالکل حکمراں پارٹی کے قبضہ میں لے لیا گیا۔ تاکہ قوم کے کانوں میں اسکی آواز کے سوا کسی طرف سے کوئی دوسری آواز پہنچنے ہی نہ پائے۔ یہی نہیں بلکہ ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں کہ اول تو غالب پارٹی کی رائے کے سوا کوئی رائے دماغوں میں پیدا ہی نہ ہو، اور اگر کچھ نالائق دماغ ایسے نکل آئیں جو خداوندانِ ملّت کے خیالات سے مختلف خیالات رکھتے ہوں تو یا تو ان کے خیالات ان کے دماغ ہی میں دفن رہیں یا پھر ان کے دماغ زمین میں دفن ہو جائیں۔

انہوں نے بظاہر یہ بڑا ہی معقول سا نظریہ اختیار کیا کہ اجتماعی زندگی میں کوئی مرکزی منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے انتشار، بدنظمی، اور باہمی کشمکش بھی پیدا ہوتی ہے اور مجموعی طور پر طاقت اور ذرائع کا ضیاع بھی بہت بڑے پیمانے پر ہوتا ہے، لہٰذا پوری قومی زندگی کو منظم ہونا چاہیئے اور ایک مرکزی حکم کے تحت، ایک مرکزی طاقت کے مقرر کئے ہوئے نقشے پر تمام افراد کو بالکل ایک مشین کے پرزوں کی طرح باقاعدہ کام کرنا چاہیئے۔
انہوں نے خیال کیا کہ پیداوار، اور ترقی اور خوشحالی کو تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھانے کی یہی ایک صورت ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے مطابق انہوں نے سارے ملک کی زندگی کو اس کے تمام معاشی، تمدنی، مذہبی، تہذیبی اور سیاسی پہلوؤں سمیت ایک ضابطے میں کس ڈالا اور ایک بندھے ٹکے منصوبے پر چلانا شروع کر دیا۔
اُن کے نظامِ زندگی میں سب کچھ مقرر تھا۔ ہر شخص اور ہر ادارے کا کام مقرر۔ اجرتیں مقرر۔ قیمتیں مقرر۔ حقوق اور فرائض مقرر۔ قوتوں اور قابلیتوں کے استعمال کی صورتیں مقرر۔ سرمائے اور وسائل و ذرائع کے مصرف مقرر۔ حتیٰ کہ فکر و خیال اور جذبات و رجحانات کی راہیں تک مقرر۔ اور ان سب کے لئے کئی کئی سال کے پروگرام مقرر۔
اب یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے محض قوم کی خاطر اتنی تکلیفیں اٹھا کر اور اتنی مغز زنی کر کے پوری قومی زندگی کی اتنے بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کی ہو، وہ بھلا کیسے برداشت کر لیتے کہ ایک شخص اٹھے اور ان پر تنقید کر کے دماغوں میں انتشار پھیلائے، جن کارکنوں کو کام میں منہمک ہونا چاہیئے انہیں بحث میں الجھا دے، اور اتنی محنت سے بنائے ہوئے منصوبے پر سے عوام الناس کا اطمینان اور اعتماد ختم کر دے۔
پس یہ "منصوبہ بند" زندگی کی اندرونی منطق ہی کا تقاضا تھا جس کی بنا پر وہ تنقید اور رائے زنی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے اور اس بات پر مصر تھے کہ جس کو بولنا ہو وہ ہمارے پروگرام کی موافقت میں

بولے ورنہ اپنا منہ بند رکھے ، منصوبہ بندی ہو گی تو زبان بندی اور خیال بندی بھی ضرور ہو گی۔ اختلاف رائے بند، بحث بند، تنقید بند، مواخذہ اور احتساب بند، بلکہ چند خاص دماغوں کے سوا ساری قوم کے دماغوں کا سوچنا بھی بند۔

یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ نازی اور فاشی مسلک جو کچھ دیتے ہیں کیا وہ اس قیمت پر لینے کے قابل ہے ؟ ساری قوم میں چند انسان تو ہوں انسان ، اور باقی سب بن کر رہیں مویشی ، بلکہ ایک مشین کے بےجان پرزے۔ اس قیمت پر یہ اطمینان نصیب ہوتا ہے کہ سب کو چارہ برابر ملتا رہے گا !

نظام سرمایہ داری کی اندرونی اصلاحات اب ہمیں ایک نظر یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ جن ممالک میں وسیع الشرب جمہوریت کی جڑیں مضبوط تھیں انہوں نے نظام سرمایہ داری کو اسکی اصل بنیادوں پر قائم رکھتے ہوئے اس کے اندر کس قسم کی اصلاحات کیں اور ان سے کیا نتائج برآمد ہوتے۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، اٹھارویں صدی میں بورژوا طبقہ ایک طرف اپنے معاشی مفاد کے لئے بے قید معیشت کے اصول پیش کر رہا تھا اور دوسری طرف یہی طبقہ اپنے سیاسی مفاد کے لئے جمہوریت ، مساوات ، اور حاکمیتِ عوام کا صور پھونک رہا تھا، آزادی رائے ، آزادی ضمیر، آزادی تحریر و تقریر اور آزادی اجتماع کے حقوق کا مطالبہ کر رہا تھا ، حتیٰ کہ اس بات پر بھی زور دے رہا تھا کہ ناقابل برداشت جبر کے مقابلہ میں رعایا کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا حق ہے۔ ابتدا میں جب یہ لوگ ان نظریات کو پیش کر رہے تھے تو ان کے پیشِ نظر شاہی خاندان ، مالکِ زمین طبقے اور ارباب کلیسا تھے ، سامنے وہ اُن کو دیکھتے تھے اور مقابل میں صرف اپنے آپ کو پاتے تھے۔ اس لئے ان کو بالکل یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ایک طرف جس بے قید انفرادیت پر معاشی نظام کی بنیادیں اٹھا رہے ہیں اور دوسری طرف سیاسی نظام کی عمارت جس جمہوریت اور تمدنی مساوات پر تعمیر کر رہے ہیں ، یہ دونوں کبھی ایک دوسرے کی ضد ثابت ہوں گی اور آپس میں ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں گی۔

جب ان کی جدوجہد سے نئے جمہوری نظام نے مختلف ممالک میں جنم لینا شروع کیا اور ووٹ کا حق مالکانِ زمین سے گزر کر تاجروں ، کارخانہ داروں اور ساہوکاروں تک وسیع ہوا تو پھر یہ ممکن نہ رہا کہ کسی دلیل

سے اسکو مزدوروں اور کاشتکاروں اور محنت پیشہ عوام تک پہنچنے سے روکا جا سکے۔ بورژوا حضرات نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کی اپنی ہی منطق ان کے خلاف کام کرنے لگی، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ان کو اسی طرح عوام کا حق رائے دہی تسلیم کرنا پڑا جس طرح پہلے مالکان زمین کو خود ان کا حق ماننا پڑا تھا۔ پھر کسی دلیل سے یہ بات بھی معقول ثابت نہ کی جا سکتی تھی کہ مستاجروں کے لئے تو اپنی تنظیم جائز ہو اور اجیروں کے لئے جائز نہ ہو۔ یا مستاجر تو اپنی شرائط اپنی متحدہ طاقت سے اجیروں پر عاید کریں مگر اجیر اپنی جماعت کے زور سے اپنی شرائط منوانے کے مجاز نہ ہوں۔ اس طرح رفتہ رفتہ مزدوروں اور ملازموں کا یہ حق بھی تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اپنی انجمنیں بنائیں، اکیلے اکیلے نہیں بلکہ مجموعی طاقت سے اجرتوں اور تنخواہوں اور شرائطِ کار کے نئے سودے چکائیں، اپنی شکایات رفع کرانے کے لئے ہڑتال کا حربہ استعمال کریں، اور ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لئے پہرہ لگائیں۔

انیسویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ سیاست کا یہ پرانا نظریہ بھی ختم ہونے لگا کہ ریاست کا کام فقط شخصی آزادی کی حفاظت ہے اور قومی زندگی میں ریاست کے ایجابی فرائض کچھ بھی نہیں ہیں۔ اب اسکی جگہ یہ احساس خود بخود ابھرنا شروع ہوا کہ ایک جمہوری ریاست تو خود باشندگان ملک ہی کی متفقہ مرضی کی مظہر ہوتی ہے اور جمہور اپنی ہی سیاسی طاقت کو ریاست کی شکل میں مرتکز اور منظم کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ پرانی شاہی حکومتوں کی طرح اب جمہوری حکومت کے دائرہ عمل کو بھی محدود رکھنے پر اصرار کیا جائے۔ جمہوری حکومت کے فرائض محض سلبی نہ ہونے چاہئیں بلکہ اسے ایجابی طور پر اجتماعی مفاد کے لئے کام کرنا چاہیئے، اور اگر معاشرے میں بے انصافیاں پائی جاتی ہوں تو قانون سازی اور انتظامی مداخلت، دونوں کے ذریعہ سے اسکو اُن کا تدارک کرنا چاہیئے۔

حالات یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ یکایک جنگ عظیم اول پیش آگئی، پھر روس میں وہ اشتراکی انقلاب برپا ہوا جس نے بورژوا طبقہ کے زن بچے تک کو کولہو میں پیل دیا۔ پھر جرمنی اور اٹلی میں اس کا ردِ عمل فاشیت اور نازیت کی شکل میں رونما ہوا جس نے بورژوا اور محنت پیشہ عوام، سب کو ایک سخت جابرانہ نظام میں کس دیا۔ ان واقعات نے سرمایہ داری کو اچھا خاصا "روشن خیال" بنا دیا اور وہ کچھ تو عوام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے دباؤ سے، اور کچھ خود اپنی مرضی سے پرانی بے قید معیشت کے نظام میں حسب ذیل تغیرات قبول کرتی چلی گئی:

۱۔ ہر شعبۂ معیشت میں مزدوروں اور ملازموں کی انجمنوں کی اجتماعی تنظیمات کو باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا ہے جو ان کی طرف سے بات

کرنے کی مجاز ہیں۔ اس کے ساتھ ایک حد تک رسمی یا قانونی طور پر بعض ایسی عملی تدبیروں کو بھی جائز و معقول مان لیا گیا ہے جنہیں مزدوروں اور ملازموں کی انجمنیں اپنے مطالبات منوانے اور ان کی خاطر دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کر سکتی ہیں۔ اس طرح اگرچہ سرمایہ و محنت کی کشمکش ختم تو نہیں ہوئی، لیکن محنت اب سرمایہ کے مقابلہ میں اُتنی بے بس بھی نہیں رہی ہے جتنی بے قید معیشت کے دور میں تھی۔

۲- اجرتوں میں اضافہ، اوقاتِ کار میں کمی، کام کرنے کے حالات میں نرمی، عورتوں اور بچوں سے محنت لینے پر پابندی، مزدور کی جان اور صحت کی نسبتہً زیادہ پروا، اس کے گھر اور ماحول کو پہلے سے بہتر بنانے کی کوشش، جسمانی نقصان پہنچ جانے کی صورت میں اس کی کچھ نہ کچھ تلافی، اور پھر سوشل انشورنس کی بھی بعض اسکیموں کی ترویج، یہ سب کچھ اگرچہ اُس حد تک نہیں ہوا جتنا ہونا چاہیئے تھا، لیکن بہر حال اب مزدوروں اور نچلے طبقے کے ملازموں کا حال اُتنا خراب بھی نہیں ہے جتنا پہلے تھا۔

۳- حکومت کی یہ حیثیت تسلیم کر لی گئی ہے کہ وہ محنت اور سرمایہ کے درمیان حکم بنے۔ نیز ان کی باہمی کشمکش کو دور کرنے اور ان کے جھگڑے چکانے کی مختلف قانونی صورتیں بھی مقرر کر دی گئی ہیں۔ یہ چیز اگرچہ اس حد تک نہیں پہنچی ہے کہ ہر شعبۂ معیشت میں اجیر اور مستاجر کے درمیان حقوق و فرائض کا منصفانہ تعین کر دیا جائے، اور ابھی معاشی نزاعات میں عدالتی فیصلہ دینے کا کام بھی حکومت نے پوری طرح سے اپنے ہاتھ میں نہیں لیا ہے، لیکن اصولاً حکومت کا یہ منصب تسلیم کر لیا گیا ہے۔

۴- یہ اصول بھی مان لیا گیا ہے کہ انفرادی نفع اندوزی پر ایسی پابندیاں عائد ہونی چاہئیں جن سے وہ اجتماعی مفاد کے خلاف نہ ہونے پائے۔ اور یہ کہ ایسی پابندیاں عائد کرنا حکومت ہی کے فرائض میں سے ہے۔

۵- بعض ایسی معاشی خدمات کو حکومتوں نے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جو یا تو انفرادی کاروبار کے بس کی نہیں ہیں، یا جنہیں افراد کے قبضہ میں دینا مجموعی مفاد کے خلاف ہے۔ مثلاً ڈاک اور تار اور وسائل حمل و نقل کا انتظام۔ سڑکوں اور شاہراہوں کی تعمیر اور ان کو درست حالت میں رکھنا۔ جنگلات کی پرداخت اور ان کا نظم و نسق۔ آب رسانی اور آب پاشی۔ برق آبی کی پیدائش اور تقسیم۔ روپے کا کنٹرول اس کے علاوہ اکثر حکومتوں نے معدنیات کو بھی اپنے اجارے میں لے لیا ہے اور بعض بڑی بڑی صنعتوں کو اپنے انتظام میں چلانا شروع

کر دیا ہے۔

۶۔ تھوڑی تھوڑی آمدنیاں رکھنے والے ملازموں اور مزدوروں کے لئے ایسے مواقع پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ وہ تھوڑا تھوڑا پس انداز کر کے تجارتی اور صنعتی کمپنیوں میں کم قیمت کے حصے خرید لیں۔ اور بعض جگہ ایسی صورتیں بھی اختیار کی گئی ہیں کہ خاص خاص قواعد کے مطابق ملازموں اور مزدوروں کی اجرتوں کا ایک حصہ ان کو نقد ملتا جاتا ہے اور ایک حصہ ان کی طرف سے کمپنی کے سرمایہ میں شریک ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح بکثرت محنت پیشہ کارکن اُس کمپنی یا کارپوریشن کی ملکیت میں حصہ دار بھی ہو گئے ہیں جس کے اندر وہ مزدوری یا ملازمت کر رہے ہیں بعض بڑے بڑے مشہور کارخانوں میں ۸۰ فی صدی اور ۹۰ فی صدی مزدور اور ملازم شریک ملکیت ہو چکے ہیں اور اقساط پر حصے خریدنے کی آسانیاں حاصل ہونے کی وجہ سے کارخانوں میں ان کی حصہ داری کا تناسب برابر بڑھتا جا رہا ہے۔

وہ خرابیاں جو اب تک نظام سرمایہ داری میں باقی ہیں

لیکن ان تمام تغیرات، ترمیمات اور اصلاحات کے باوجود ابھی تک نظام سرمایہ داری کے بنیادی عیوب جوں کے توں باقی ہیں۔

ابھی تک بے روزگاری کا استیصال نہیں ہو سکا ہے۔ بلکہ زمانۂ جنگ کے سوا دوسرے تمام حالات میں یہ ایک مستقل مرض ہے جو نظام سرمایہ داری کے تحت سوسائٹی کو لگا رہتا ہے۔ امریکہ جیسے ملک میں جس کی صنعت و حرفت اور پیداوار دولت آسمانِ عروج کو پہنچی ہوئی ہے، جنگی مشاغل کم ہوتے ہی ۲۲ لاکھ سے زیادہ آدمی بے کار ہو گئے، اپریل و مئی ۱۹۴۹ء کے درمیان ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۳۵ لاکھ سے اوپر ہو گئی، اور جون میں ۴۰ لاکھ تک جا پہنچی۔ تجارت و صنعت کی گرم بازاری کا زمانہ ہو یا سرد بازاری کا زمانہ، بے روزگاری کم و بیش ہر حال میں نظام سرمایہ داری کی جزو لاینفک بنی رہتی ہے۔

ابھی تک وہ عجیب و غریب معمہ جوں کا توں بے حل پڑا ہوا ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ایک طرف تو کروڑہا انسان ضروریات زندگی کے حاجت مند اور اسباب عیش کے خواہشمند موجود ہیں، بے حد و حساب قدرتی وسائل موجود ہیں جنہیں استعمال کر کے مزید اشیاء تیار کی جا سکتی ہیں۔ اور لکھوکھا آدمی ایسے موجود ہیں جنہیں کام پر لگایا جا سکتا ہے لیکن دوسری طرف نظام سرمایہ داری دنیا کی ضرورت اور امکانی کھپت سے بہت کم جو مال تیار کرتا ہے وہ بھی بازار میں پڑا رہ جاتا ہے کیونکہ لوگوں کے پاس اسکو خریدنے کے لئے روپیہ نہیں ہے،

اور جب تھوڑا مال ہی نہیں نکلتا تو مزید آدمیوں کو کام پر لگانے اور قدرتی وسائل کو استعمال کرنے کی ہمت نہیں کی جا سکتی، اور جب آدمی کام پر ہی نہیں لگائے جاتے تو ان میں قوتِ خریداری پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

یہی نہیں بلکہ ابھی تک نظامِ سرمایہ داری کا یہ عیب بھی علیٰ حالہٖ قائم ہے کہ ہر سال بہت بڑی مقدار میں تیار کیا ہوا مال اور پیدا کیا ہوا غلّہ اور پھل اور دوسرا سامان بازار میں لانے کے بجائے قصداً برباد کر دیا جاتا ہے، درآنحالیکہ کروڑوں آدمی ان اشیاء کے طالب موجود ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار ان چیزوں کو غارت کر دینا اور اس غارت گری پر لاکھوں روپے صرف کر دینا زیادہ پسند کرتا ہے بہ نسبت اس کے کہ انہیں بازار میں لا کر ان کی قیمتیں گھٹائے اور انہیں سستے داموں حاجت مند انسانوں تک پہنچنے دے۔

ابھی تک نظامِ سرمایہ داری کا یہ عیب بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ ریاست، سوسائٹی، مالدار طبقہ، غرض کوئی بھی اپنے آپ کو اُن لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی کفالت اور دستگیری کا ذمہ دار نہیں سمجھتا جو قابلِ کار ہونے کے باوجود بے کار ہوں، یا ابھی قابلِ کار نہ ہوتے ہوں یا مستقل یا عارضی طور پر ناکارہ ہو گئے ہوں۔ اب بھی علاج کا مستحق وہی بیمار ہے جس کی جیب میں پیسہ ہو۔ اب بھی تعلیم و تربیت کا مستحق وہی یتیم ہے جس کا باپ انشورنس پالیسی چھوڑ مرا ہو۔ اب بھی حوادث میں گر کر وہی شخص اُٹھ سکتا ہے جو پہلے اچھے دن دیکھ چکا ہو اور اُن دنوں میں اس نے خود ہی برے وقت کے لئے سہارے کا سامان کر رکھا ہو۔ غرض ابھی تک مصیبت زدہ، حاجت مند، بے وسیلہ آدمی بجائے خود کسی کی بھی ذمہ داری نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ کہیں اتفاقاً کسی کو کچھ مدد مل جائے۔

ابھی تک نظامِ سرمایہ داری کا یہ عیب بھی دور نہیں ہوا ہے کہ مصنوعی طور پر قیمتیں چڑھائی جاتی ہیں اور باقاعدہ منصوبے بنا بنا کر بعض اشیا کا قحط پیدا کیا جاتا ہے۔ غائب سودے اور تجارتی قمار بازی کے مختلف طریقے اب بھی اجتماعی معیشت کے مزاج کو شب و روز درہم برہم کرتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو اب بھی کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے کہ اگر وہ ایک بڑا سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں تو اپنے ذاتی نفع کے لئے جو مال چاہیں اور جتنا چاہیں تیار کریں اور معاشرے پر اسکو ٹھونسنے کی جس طرح چاہیں کوشش کریں، خواہ معاشرے کو اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو، بلکہ اُس کے لئے وہ چیز مضر ہی کیوں نہ ہو۔ اب بھی یہ عجیب صورتِ حال رات دن مشاہدے میں آ رہی ہے کہ معاشرے کی نہایت اہم اور سخت ضرورتیں تو رکی پڑی ہیں مگر محنت اور سرمایہ

عیش و عشرت کے سامانوں پر، شہواتِ نفس کے کھلونوں پر اور خوشحالی کے چونچلوں پر بے تحاشا صرف ہو رہا ہے۔ اب بھی صنعت اور تجارت کے بادشاہ اور مالیات کے شہنشاہ اپنی اغراض کے لئے وہ کھلی اور چھپی ریشہ دوانیاں کیئے جا رہے ہیں جو بین الاقوامی کشمکش، رقابت اور جنگ کی موجب ہوتی رہتی ہیں۔

ابھی تک نظام سرمایہ داری میں معاشرے اور ریاست کی نکیل ساہوکار (بینکر) کے ہاتھ میں ہے اور وہ ساری اجتماعی قدروں کو شرح سود کے معیار پر جانچ رہا ہے اور اسی محور پر ان کو گھما رہا ہے۔ یہ فیصلہ وہ کرتا ہے کہ سرمایہ کو کن کاموں پر خرچ ہونا چاہیئے اور کن پر نہ ہونا چاہیئے۔ اور اس فیصلے کے لئے اس کے پاس معیار یہ نہیں ہے کہ معاشرے کے لئے ضروری اور مفید کون سے کام ہیں بلکہ یہ ہے کہ بازار کی شرح سود کے برابر یا اس سے زائد نفع کن کاموں میں ہے۔ اس معیار کے لحاظ سے اگر آب رسانی کی بہ نسبت شراب رسانی زیادہ نفع آور ہوگی تو وہ بلا تامل عوام الناس کو صاف پانی کے لئے ترستا چھوڑ کر عیاشوں کو شراب پلانے کی فکر میں لگ جائیگا۔

ابھی تک نظام سرمایہ داری کو وہ بیماری بھی لگی ہوئی ہے جسے "کاروبار کا چکر" Trade Cycle کہتے ہیں، جس میں ہر چند سال کی گرم بازاری کے بعد دنیا کی معیشت پر کساد بازاری کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ کاروبار کی دنیا پوری تیز رفتاری کے ساتھ مزے سے چل رہی ہوتی ہے کہ یکایک تجار محسوس کرتے ہیں کہ جو مال ان کے گوداموں میں آ رہا ہے وہ مناسب رفتار سے نکل نہیں رہا۔ وہ ذرا فرمائشیں روکتے ہیں۔ صناع یہ حال دیکھ کر ذرا مال کی تیاری سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔ سرمایہ دار خطرے کی اس علامت کو بھانپتے ہی قرض سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور پہلے کا دیا ہوا بھی واپس مانگنے لگتا ہے۔ کارخانے بند ہونے شروع ہوتے ہیں۔ بے روزگاری بڑھتی ہے قیمتیں گرنی شروع ہوتی ہیں۔ تاجر اور گاہک مزید قیمتیں گرنے کی امید پر فرمائش اور خریداری سے ہاتھ روکتے ہیں۔ چلتے ہوئے کارخانے بھی پیداوار کم کر دیتے ہیں جس سے بے روزگاری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ حکومتیں آمدنی گھٹتی دیکھ کر مصارف میں تخفیف کرنے لگتی ہیں۔ کساد بازاری میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہر قدم جو پیچھے ہٹتا ہے، کئی قدم اور پیچھے ہٹنے کا سبب بنتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب قطعی اور کلی دیوالہ کی سرحد قریب آ جاتی ہے تو یکایک رُخ بدلتا ہے، آہستہ آہستہ چڑھاؤ شروع ہو جاتا ہے، اور پھر گرم بازاری کا دور آ جاتا ہے۔ یہ چکر نظام سرمایہ داری کے لئے ایک مستقل مرض بن چکا ہے جس کا ابھی تک کوئی علاج دریافت

نہیں ہوا۔

یہ اور دوسرے بہت سے چھوٹے بڑے عیوب آج کی مقیّد اور اصلاح یافتہ سرمایہ داری میں بھی اسی طرح موجود ہیں جس طرح انیسویں صدی کی بے قید و بد اطوار سرمایہ داری میں پائے جاتے تھے۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ جمہوریت نے اس نظام کے اصل اسبابِ خرابی کو سمجھ کر حکمت کے ساتھ انہیں دور کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی ہے، بلکہ جو کچھ ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جتنا جتنا محنت پیشہ عوام کا دباؤ پڑتا گیا ہے، یا اشتراکیت کا خطرہ بڑھتا گیا ہے، بورژوا طبقے اپنے طریقوں میں ایسی ترمیمات کرتے چلے گئے ہیں جن سے عوام کی شکایات اس حد تک ہلکی پڑ جائیں کہ اشتراکی لوگ ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

۵

تشخیص و علاج

پچھلے صفحات میں جو تاریخی بیان پیش کیا گیا ہے اس پر مجموعی نگاہ ڈالنے سے ایک عام ناظر کے سامنے کئی باتیں بالکل وضاحت کے ساتھ روشن ہو جائیں گی۔

سب سے پہلے تو وہ اُن مسائل اور اُن پیچیدگیوں کو صاف پہچان جائیگا جو مغرب کی تاریخ اور ہماری موجودہ اجتماعی زندگی میں مشترک ہیں۔ وہ دیکھے گا کہ یہاں نظام جاگیرداری بھی اپنی بہت سی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔ اور جدید سرمایہ داری بھی اپنے بہت سے عیوب کے ساتھ جنم لے چکی ہے۔ کچھ بیماریاں ہم نے اپنے دورِ انحطاط سے میراث میں پائی ہیں۔ اور کچھ مغرب کے صنعتی انقلاب اور نظام سرمایہ داری کے جلو میں ہم تک پہنچی ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ یہاں کوئی پاپائیت اور کوئی کلیسائی نظام موجود نہیں ہے۔ نہ کوئی ایسا مذہبی طبقہ Priest Class موجود ہے جس کا صاحبِ فضل طبقوں سے گٹھ جوڑ ہو اور وہ خدا اور مذہب کا نام لے کر بے جا امتیازات اور زبردستی جمائے ہوئے حقوق کی حمایت کرے۔

پھر اس تاریخی مطالعہ سے ناظر کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ہاں کے بوجھ بجھکڑ اپنی سوسائٹی کے مسائل اور پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لئے آئے دن جو طُرفہ تجویزیں پیش کرتے رہتے ہیں اُن کا شجرۂ نسب کیا ہے۔ یہ جو ہم سنا کرتے ہیں کہ کوئی صاحب "اجتماعی منصوبہ بندی" کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں، اور کوئی دوسرے صاحب ملک کے معاشی نظام میں "انقلابی تبدیلیاں" چاہتے ہیں، اور کوئی تیسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر "قومایا" دیا جائے[1]، اور کسی طرف سے آواز آتی ہے کہ ساری کلیدی صنعتیں بھی "قومائی جائیں"۔ اور کہیں عطائیوں کی مجلس بڑے غور و خوض کے بعد یہ نسخۂ کیمیا لے کر آتی ہے کہ زمینداریوں کو ختم کر دیا جائے، یہ سب وہ نوادرِ حکمت ہیں جو مغرب کے اناڑیوں کی بیاض سے اڑائے گئے ہیں اور اب یہاں وہ سب تجربات ہوا چاہتے ہیں جو روس میں، جرمنی و اٹلی میں اور امریکہ و انگلستان میں ہو چکے ہیں۔ مگر

---

[1] یعنی قومی ملکیت بنایا جائے۔ (Nationalise کر دیا جائے۔ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ میں اردو میں اس انگریزی طرز کی تصریف و اشتقاق کو جائز سمجھتا ہوں۔ در اصل میں نے طنزیہ انداز کلام کی مناسبت سے یہاں اس بدعت کا ارتکاب کیا ہے۔

اس معاملہ میں بھی ہماری اور اُن کی مماثلت ایک فرق کے ساتھ ہے۔ وہاں کے اناڑی کم از کم مجتہد تو ہیں۔ لیکن یہاں جو حضرات مطب کھول بیٹھے ہیں وہ اناڑی پن کے ساتھ مقلد بھی ہیں۔ مغرب کے اناڑی نقصان ہوتے دیکھیں گے تو نسخے میں کچھ ردوبدل کر لیں گے۔ مگر یہاں مغرب سے ہی کسی ردوبدل کی اطلاع آجائے تو بات دوسری ہے ورنہ ڈاکٹر مریض کی آخری ہچکی تک انشاء اللہ ایک ہی نسخہ پلاتا رہے گا۔

ایک اور بات جو مغربی ممالک کی تاریخ تمدن و تہذیب اور داستانِ افکار و اعمال میں آدمی کو نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ پیہم کشمکش نزاع اور جدال ہے۔ ایک گروہ زندگی کے میدان پر قابض ہو کر اخلاق کو، مذہب کو، قانون کو، رسم و رواج کو، اور تمدن کے سارے نظام کو ایک رُخ پر کھینچ لے جاتا ہے یہاں تک کہ دوسرے گروہوں کے ساتھ بے انصافی کی انتہا ہو جاتی ہے۔ پھر ان مظلوم گروہوں میں سے کوئی ایک اٹھ کر اس ظالم گروہ سے گتھ جاتا ہے اور اس کے غلط کے ساتھ اس کے صحیح پر بھی خطِ نسخ پھیرتا ہے اور فکر و عمل کے پورے نظام کو پہلی انتہا سے کھینچ کر دوسری انتہا کی طرف لے جاتا ہے یہاں تک کہ پھر بے انصافی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد شکوہ و شکایت سے گزر کر نوبت ایک تیسری بغاوت تک پہنچتی ہے۔ اور ضد اور ہٹ دھرمی کا طوفان پھر جھوٹ کے ساتھ سچ کو بھی بہالے جاتا ہے اور اگلوں سے بھی بڑھ کر ایک اور انتہا پسندانہ نظام قائم ہو جاتا ہے۔ اس طوفان کی تباہ کاریاں دیکھ کر اس کے مقابلے میں ایک جوابی طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ بھی اپنے حریف سے کچھ کم انتہا پسند نہیں ہوتا۔ اس کھینچ تان کی وجہ سے مغرب کی تاریخ آدمی کو کچھ اس طرح سفر کرتی نظر آتی ہے جیسے ایک شرابی لڑکھڑاتا ہوا خطِ منحنی چل رہا ہو، نہ کہ ایک ہوشمند انسان سویّا علیٰ صراطِ مستقیم چلا جا رہا ہو۔ ہیگل اور مارکس بیچارے اس منظر کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ انسانی تمدّن کے ارتقاء کی فطری چال یہی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سب کچھ نتائج ہیں صرف ایک چیز کے اور وہ یہ ہے کہ اہلِ مغرب مدتہائے دراز سے بغیر ھدیً و لا کتابٍ منیر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سینٹ پال کے توسط سے جو عیسائیت اُن کو پہنچی تھی اس کا رشتہ شریعت سے پہلے ہی توڑا جا چکا تھا۔ اس کے پاس مسیح علیہ السلام کے چند اخلاقی مواعظ کے سوا کوئی ایسی خدائی ہدایت سرے سے موجود ہی نہ تھی جس پر تمدن و سیاست و معیشت کا ایک وسیع نظام تعمیر کیا جا سکتا۔ بائیبل کا پرانا عہد نامہ خود بھی ۲ فیصدی خدائی ہدایت کے ساتھ

۰ و فیصدی انسانی کلام کی آمیزش اپنے اندر لئے ہوئے تھا۔ اس لئے اگر بعد میں انہوں نے نیم عقیدت اور نیم بے عقیدگی کے ساتھ اسکی طرف رجوع کیا بھی تو اس سے کچھ بہت زیادہ رہنمائی نہ مل سکی۔ اسلام عین اس زمانے میں یورپ کے سامنے آچکا تھا جب کہ مغربی رومن امپائر کا نظام درہم برہم ہوئے تھوڑی ہی مدت گزری تھی اور دورِ متوسط کی تاریکی کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا۔ لیکن جس یورپ نے دینِ مسیحی کو اس شرط پر قبول کیا تھا کہ شریعت اس کے ساتھ نہ ہو، وہ بھلا اس اسلام کی طرف حصولِ ہدایت کے لئے کیسے توجہ کرتا جو شریعت کے بغیر نرا دین و ایمان پیش کرنے کے لئے کسی طرح تیار ہی نہ تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے، اور کچھ پادریوں کے پھیلائے ہوئے تعصبات کی وجہ سے، یورپ نے اسلام سے بھی کوئی روشنی حاصل نہ کی۔ اب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ اہلِ مغرب خود ہی اپنی عقل سے اپنے لئے نظامِ زندگی بناتے۔ چنانچہ یہی انہوں نے کیا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ انسان خالص عقلی فیصلے نہیں کر سکتا۔ اُس کی عقل کے ساتھ خواہش، کا گمراہ کن شیطان بھی لگا ہوا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سارے انسان ایک ساتھ مل کر کوئی نظامِ زندگی وضع نہیں کیا کرتے۔ کچھ بیدار مغز لوگ ہی ایک نظام تجویز کرتے ہیں اور وہ علم و عقل رکھنے کے ساتھ لامحالہ کچھ اپنے ذاتی و طبقاتی تعصبات بھی رکھتے ہیں جن کی وجہ سے ان کا نظام انہی لوگوں کو اپیل کرتا ہے جو ان کے ساتھ ان کے تعصبات میں شریک ہوں۔ یہی اسباب ہیں جن کی بنا پر یورپ میں وقتاً فوقتاً جتنے نظامِ زندگی بھی بنتے رہے وہ سب غیر متوازن تھے، اور اس عدمِ توازن کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ وہاں ایک پیہم کشمکش اور کھینچ تان جاری رہتی۔

سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع ہم بھی اس دنیا میں بعینہٖ ھٰذیٰ دکا کتاب منیر ہی ہیں؟ کیا ہمارے لئے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ قدیم ہندوانہ جاہلیت، اور دورِ متوسط کے مغل نظام اور دورِ حاضر کے فرنگی تمدن نے مل جل کر جن مسائل سے ہم کو دوچار کر دیا ہے اُن کے حل کی وہی صورتیں اختیار کریں جو اشتراکیت، نازیت، فاشیت اور سرمایہ داری نے مغرب میں اختیار کی ہیں؟ کیا ہمارے پاس بھی کوئی ایسی روشنی موجود نہیں ہے جس کی مدد سے ایک متوازن نظام بنایا جا سکتا ہو؟ ـــــ جو شخص اسلام کو جانتا ہو وہ اِن سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔

اصلی الجھن اسلام کے اصول پر ہم اِن مسائل کو کس طرح حل کر سکتے ہیں اسکو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک مرتبہ واضح طور پر اس اصلی الجھن کو سمجھ لیا جائے جس سے اس وقت دنیا دوچار ہے اور ہم کو بھی دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔

مختصر الفاظ میں وہ الجھن یہ ہے کہ

اگر ہم بے قید معیشت کے اصول اختیار کرتے ہیں (جن کی رو سے ہر شخص کو بے روک ٹوک یہ موقع حاصل رہتا ہے کہ جس قدر ذرائع پیداوار کو چاہے اپنے قبضے میں لائے اور جس طرح چاہے اپنے نفع کے لئے سعی وجہد کرے۔ نیز جن کی رو سے سوسائٹی میں عدل وتوازن قائم کرنے کے لئے صرف مقابلہ ومسابقت اور کسر وانکسار کے خودرو قوانین ہی پر اعتماد کر لیا جاتا ہے) تو اس سے سرمایہ داری نظام کی وہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور ہماری سوسائٹی کی حد تک جاگیرداری نظام کی بھی وہ بہت سی خرابیاں باقی رہ جاتی ہیں، جن کا ذکر اس سے پہلے ہم "نظام جاگیرداری" اور "جدید نظام سرمایہ داری" کے زیر عنوان کر چکے ہیں۔

اور اگر ہم انفرادی ملکیت کے طریقے کو ختم کر کے تمام ذرائع پیداوار پر اجتماعی قبضہ وتصرف قائم کر دیتے ہیں، تو بلاشبہ مذکورۂ بالا خرابیوں کا تو بڑی حد تک تدارک ہو جاتا ہے، مگر اول تو یہ بنیادی تغیر ہی جان ومال کی اس بے دریغ بربادی اور مذہب واخلاق سے اس کھلی بغاوت کے بغیر نہیں ہو سکتا جس کی مثال روس کے اشتراکی انقلاب میں ہم کو ملتی ہے۔ دوسرے اگر بالفرض یہ تغیر پُرامن جمہوری طریقوں سے ہو بھی جائے تو اجتماعی ملکیت کا نظام بہرحال انفرادی آزادی کو قطعی ختم کر دیتا ہے۔ جمہوری طریقوں سے سوشلزم قائم کرنا درحقیقت جمہوریت کے ذریعہ سے جمہوریت کو ختم کرنا ہے۔ اس لئے کہ جمہوریت تو اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتی کہ سوسائٹی میں کم از کم ایک بہت بڑی اکثریت آزاد پیشہ ور لوگوں کی موجود رہے، لیکن سوشلزم اس کے برعکس آزاد پیشوں کو ختم کر دیتا ہے۔ معیشت کا جو شعبہ بھی اجتماعی انتظام میں لیا جائے گا، اس کے تمام کارکن ایسے ہی ہو جائیں گے جیسے سرکاری ملازم۔ ملازمت پیشہ طبقہ میں جتنی کچھ آزادی رائے اور آزادی عمل پائی جاتی ہے، ہر شخص اسکو جانتا ہے۔ یہ طریق کار جتنا جتنا معیشت میں پھیلتا چلا جائے گا، آزادی فکر، آزادی گفتار، آزادی اجتماع، آزادی تحریر، اور آزادی کار کی سرحدیں سکڑتی چلی جائیں گی۔ یہاں تک کہ جس روز پوری معیشت پورے اجتماعی انتظام میں چلی جائے گی اسی روز ملک کی پوری آبادی بالکل سرکاری ملازمین میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس طرح کے نظام کی عین فطرت یہی ہے

کہ جو گروہ ایک مرتبہ اُس میں برسرِ اقتدار آجائے گا، وہ پھر ہٹایا نہ جا سکیگا۔

اور اگر ہم انفرادی ملکیت کے نظام کو مٹانے کے بجائے صرف اس پر ایک مضبوط سرکاری تسلّط (State Control) قائم کر دیتے ہیں اور پوری قومی معیشت کو ایک مرکزی منصوبہ بندی کے مطابق چلاتے ہیں، جیسا کہ فاشیت اور نازیت نے کیا، تب بھی نظام سرمایہ داری کی بہت سی خرابیوں کا مداوا تو ہو جاتا ہے، مگر انفرادی آزادی کے لئے آہنی ضابطہ بندی بھی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اس کے نتائج عملاً وہی کچھ ہیں جو سوشلزم کے نتائج ہیں۔

اور اگر ہم نظام سرمایہ داری کو اسکی اصل بنیادوں پر قائم رکھتے ہوئے اس کے اندر اس طرح کی اصلاحات کرتے ہیں جیسی اب تک امریکہ اور انگلستان وغیرہ ممالک میں ہوئی ہیں تو ان سے جمہوریت اور انفرادی آزادی تو برقرار رہتی ہے مگر اُن بڑی اور اصلی خرابیوں میں سے کوئی ایک بھی دور نہیں ہوتی جن کی بدولت نظام سرمایہ داری دنیا کے لئے ایک لعنت اور مصیبت بن چکا ہے۔

گویا ایک طرف کنواں ہے تو دوسری طرف کھائی۔ اجتماعی فلاح کا انتظام کیا جاتا ہے تو افراد کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ افراد کی آزادی کو بچایا جاتا ہے تو اجتماعی فلاح غارت ہو جاتی ہے۔ ایسا کوئی نظام زندگی اس وقت تک دنیا نہیں پا سکی ہے جس میں صنعتی انقلاب تو اپنی تمام برکات کے ساتھ جوں کا توں چلتا اور بڑھتا رہے اور پھر انفرادی آزادی اور اجتماعی فلاح دونوں بیک وقت پورے اعتدال کے ساتھ نبھ جائیں۔ اسی قسم کے ایک نظام کی دریافت پر دنیا کا مستقبل معلق ہے۔ اگر وہ نہ ملا تو صنعتی انقلاب ہی کے پستول سے انسان خود کشی کر لیگا اور اگر وہ مل گیا تو جو ملک بھی اس کا ایک کامیاب نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دے گا وہی دنیا کا امام بن جائے گا۔

اسلامی حل آیئے اب ہم دیکھیں کہ اسلام جو اصول ہم کو دیتا ہے ان کی بنیاد پر یہ پیچیدگی کس طرح حل کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے چند بنیادی حقیقتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

چند بنیادی حقیقتیں اولین بات جس کو جان لینا اسلامی نظام تمدن کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اصل اہمیت فرد کی ہے نہ کہ جماعت یا قوم یا معاشرے کی۔ فرد جماعت کے لئے نہیں ہے بلکہ جماعت فرد کے لئے ہے۔ خدا کے سامنے کوئی جماعت یا قوم یا معاشرہ اپنی مجموعی حیثیت میں ذمہ دار نہیں ہے بلکہ ایک ایک شخص

فرداً فرداً اپنی ذاتی حیثیت میں ذمہ دار ہے، اور اس ذاتی ذمہ داری و جواب دہی پر ہی انسان کی ساری اخلاقی قدر و قیمت کا مدار ہے۔ اجتماعی زندگی سے اصل مقصود مجموعی خوشحالی نہیں بلکہ انفرادی فلاح ہے اور ایک نظامِ جماعت کے صالح یا فاسد ہونے کا حقیقی معیار یہی ہے کہ وہ اپنے افراد کی شخصیتوں کے پھیلنے پھولنے میں اور ان کی ذاتی صلاحیتوں کے پوری طرح بروئے کار آنے میں کس حد تک مددگار (معاون) یا مانع و مزاحم ہے۔ اس بنا پر اسلام اجتماعی تنظیم کی کسی ایسی صورت کو، یا جماعتی فلاح کی خاطر کسی ایسی تدبیر کو پسند نہیں کر سکتا جس سے افراد جماعتی شکنجے میں اس حد تک کس جاتے ہوں کہ ان کی مستقل شخصیت دب جائے اور بہت سے آدمی چند آدمیوں کے ہاتھوں میں بے روح آلات بن کر رہ جائیں۔

انسان کی انفرادیت کا صحیح نشوونما اور اسکی شخصیت کا پورا پورا ابھار بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اسے فکر و عمل کی آزادی حاصل ہو۔ اس غرض کے لئے صرف آزادیِ رائے، آزادیِ تحریر و تقریر، آزادیِ سعی اور آزادیِ اجتماع ہی ضروری نہیں ہے بلکہ آزادیِ معاش بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ یہ ایک فطری حقیقت ہے جس کو ثابت کرنے کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث کی حاجت نہیں۔ صرف عقلِ عام ہی اس کا ادراک کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک راہ چلتا آدمی بھی اس بات کو خوب جانتا ہے کہ جس شخص کی معاش آزاد نہیں ہے اسے درحقیقت کوئی آزادی بھی حاصل نہیں ہے، نہ رائے کی، نہ زبان اور قلم کی اور نہ سعی و عمل کی۔ لہٰذا انسانیت کے لئے اگر کوئی معاشرہ سب سے بہتر ہو سکتا ہے تو صرف وہ جس میں ایک بندۂ خدا کے لئے اس امر کے کافی مواقع موجود ہوں کہ اپنے ضمیر کو فروخت کئے بغیر اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت سے دو وقت کی روٹی پیدا کر سکے۔ اگرچہ صنعتی انقلاب کے دور میں اس کے مواقع بہت کم رہ گئے ہیں۔ بڑے صنعتی اور تجارتی اداروں نے اور بڑے پیمانے کی کاشت نے منفرد دست کاروں اور کاریگروں کے لئے اور چھوٹے چھوٹے سوداگروں اور کاشتکاروں کے لئے زندگی کا میدان اس قدر تنگ کر دیا ہے کہ وہ اُن کے مقابلے میں اپنے آزاد پیشے کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتے۔ تاہم جس نظام میں ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت برقرار ہو اس میں باوسیلہ اشخاص کے لئے اس امر کا اچھا خاصا موقع باقی رہتا ہے کہ خود اپنے آزاد صنعتی یا تجارتی یا زراعتی ادارے قائم کریں۔ اور بے وسیلہ کارکنوں کے لئے بھی کم از کم اتنی گنجائش تو ضرور ہی باقی رہ جاتی ہے کہ ایک شخص یا ادارے کی نوکری و مزدوری ان کے ضمیر پر بار ہو تو دوسرے دروازے پر جا کھڑے ہوں۔ مگر جہاں تمام یا بیشتر ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت بنا دیا جائے، یا جہاں شخصی ملکیتوں کو باقی رکھا جائے، مگر ناجائز

وفاشی طریقے پر سارے معاشی کاروبار کو ریاست کے مکمل تسلط میں ایک ہمہ گیر منصوبہ بندی کے تحت چلایا جائے، ایسی جگہ تو افراد کی معاشی آزادی کس طرح باقی رہ ہی نہیں سکتی اور اس کے خاتمے کے ساتھ ذہنی، معاشرتی اور سیاسی آزادی کا جنازہ آپ سے آپ نکل جاتا ہے۔ لہٰذا جو نظام زندگی انسان کی انفرادیت کو عزیز رکھتا ہو اور انسانی شخصیت کے ابھار کو مقصدی اہمیت دیتا ہو اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ اجتماعی فلاح کی ایسی تمام اسکیموں کو اصولی طور پر اور قطعی وحتمی طور پر رد کر دے جن میں یہ تجویز کیا گیا ہو کہ زمینوں اور کارخانوں اور تجارتوں کو قومی ملکیت بنا لیا جائے، یا ان پر ریاست کا تازیانہ تسلط قائم کر کے ایک مرکزی منصوبہ بندی کے تحت ساری معیشت کی مشین گھمانی شروع کر دی جائے۔

یہی پوزیشن اس معاملہ میں اسلام نے اختیار کی ہے۔ وہ کمیونزم کا تو ایک اور وجہ سے بھی مخالف ہے، اور وہ یہ ہے کہ کمیونسٹ حضرات ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیت سے نکال کر قومی ملکیت بنانے کے لئے مار دھاڑ اور زبردستی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اگر اس سکیم کو نافذ کرنے کے لئے یہ غاصبانہ ظلم وستم اور ظالمانہ سلب ونہب کا طریقہ نہ بھی اختیار کیا جائے اور اس کے بجائے ارتقائی سوشلزم کے وہ طریقے استعمال کئے جائیں جن سے زمینوں اور صنعتوں اور تجارتوں کو قوانین کے ذریعہ سے بتدریج قومی ملکیت میں تبدیل کیا جاتا ہے، تب بھی اسلام کا مزاج اسکو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، کیونکہ اس طرح کا نظام اپنی عین فطرت ہی کے لحاظ سے انسانیت کُش واقع ہوا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس نازی اور فاشی طرز کی ضابطہ بندیاں اور منصوبہ بندیاں بھی اسلام کی طبیعت کے بالکل خلاف ہیں، اس لئے کہ ان کے اجتماعی فوائد خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن انسانی تشخص کے ظہور اور نشوو ارتقا اور تکمیل میں وہ بہر حال مانع ہیں۔

اس معاملہ کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ اسلام جو ذہنیت اور اخلاقی نقطۂ نظر انسان کے اندر پیدا کرتا ہے اس کا سنگ بنیاد ہے خدا کا خوف اور خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس۔ یہ دونوں اوصاف جس شخص یا گروہ میں موجود ہوں اُس پر اگر اجتماعی معاملات کی سربراہی کا بار ڈال دیا جائے تو وہ ایسا ایک نظام قائم کرنے اور چلانے کے لئے خود ہی تیار نہیں ہو سکتا جس میں اپنے ذاتی بوجھ کے ساتھ ساتھ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی انفرادی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی وہ اُن کے سر سے اتار کر خود اپنے سر پہ لاد لے۔ یہی وہ بات ہے جو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں ایک قحط کے موقع پر فرمائی تھی جب آپ سے عرض کیا گیا کہ قیمتیں بہت چڑھ رہی ہیں، آپ سرکاری طور پر اشیاء کے نرخ مقرر فرما دیجئے، تو آپ نے ایسا کرنے سے انکار فرما دیا اور عذر یہ بیان کیا کہ انی ارید ان القی اللہ ولیس لاحد عندی مظلمۃ یطلبنی بھا، "میں اپنے خدا سے اس طرح ملنا چاہتا ہوں کہ میرے خلاف کوئی ایک شخص بھی ظلم کی شکایت کرنے والا نہ ہو"[1]

مزید برآں اسلام ہر معاملہ میں انسان کو فطری حالت سے قریب تر رکھنا چاہتا ہے اور زندگی کے کسی پہلو میں بھی مصنوعی پن کو پسند نہیں کرتا۔ انسانی معیشت کے لئے فطری حالت یہی ہے کہ خدا نے رزق کے جو ذرائع زمین پر پیدا کیے ہیں ان کو افراد اپنے قبضے میں لائیں، فرداً فرداً اور گروہ گروہ بن کر ان پر تصرف اور ان سے استفادہ کریں اور اپنے آپس میں اشیاء اور خدمات کا آزادانہ لین دین کرتے رہیں۔ بغیر معلوم مدت سے اس طرز پر انسانی معیشت کا کارخانہ چلتا آرہا ہے اور یہ گنجائش کچھ اس فطری نظام ہی میں نکل سکتی ہے کہ ایک آدمی معاشرے کے اندر رہتے ہوئے بھی اپنی معیشت میں آزاد اور اپنی زندگی میں مستقل ہو سکے۔ رہے وہ بے شمار چھوٹے بڑے "ادم" جو نیم پختہ ذہن کے لوگ آئے دن تصنیف کرتے رہتے ہیں، تو وہ سب ایک نہ ایک طرح کا مصنوعی نظام تجویز کرتے ہیں جس میں آدمی ایک مستقل ذی روح انسان ذی شعور شخصیت اور ایک مقصدی اہمیت رکھنے والی ہستی کے بجائے محض اجتماعی مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ جاتا ہے۔

مصنوعی طریقوں کی طرح اسلام انقلابی طریقوں کو بھی پسند نہیں کرتا۔ زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب کسب معاش کے بکثرت ایسے ذرائع استعمال کرتے تھے جن کو اسلام نے بعد میں آکر حرام اور سخت قابل نفرت ٹھہرایا۔ مگر پہلے کی جو املاک چلی آرہی تھیں ان کے متعلق اسلام نے یہ جھگڑا نہیں اٹھایا کہ جن جن لوگوں نے حرام خوری

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ نے گرانی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اس کے علاج کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ دراصل جس چیز سے آپ نے انکار کیا تھا وہ یہ تھی کہ حکومت اپنی مصنوعی مداخلت سے قیمتوں کے پیچیدہ نظام کو درہم برہم کرے۔ اس طریقہ کو چھوڑ کر آپ نے اپنی پوری قوت کاروباری لوگوں کی اخلاقی اصلاح پر صرف فرمائی اور مسلسل تبلیغ سے یہ بات ان کے ذہن نشین کی کہ جان بوجھ کر قیمتیں چڑھانا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ تبلیغ خوب کارگر ثابت ہوئی اور کچھ زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ قیمتیں اعتدال پر آنی شروع ہو گئیں۔

کے ذریعہ سے دولت کمائی تھی اب ان کی املاک ضبط ہونی چاہئیں۔ حتیٰ کہ سود خواروں، اور قحبہ گری کا پیشہ کرنے والوں اور ڈاکہ مارنے والوں تک کے پچھلے اعمال پر گرفت نہ کی گئی جس کے قبضے میں جو کچھ تھا، اسلام کے دیوانی قانون نے [illegible] اس کے حقوقِ ملکیت تسلیم کر لیئے۔ آئندہ کے لئے حرام طریقوں کو بند کر دیا گیا، اور [illegible] فقہ [illegible] قانونِ میراث بتدریج تحلیل کرتا چلا گیا۔

تفصیلات مذکورہ بالا حقائق کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب ذرا چند صفحات پیچھے پلٹ کر ایک نظر پھر اُن مباحث پر ڈال لیجئے جو اس سے پہلے "جدید نظام سرمایہ داری" کے باب میں آپ کی نگاہ سے گذر چکے ہیں۔ وہاں بے قید معیشت کے اصولوں کی جو تشریح ہم نے کی ہے، آپ خود محسوس کریں گے کہ انسانی معیشت کے فطری اصول درحقیقت وہی ہیں، بشرطیکہ ان سے وہ مبالغہ الگ کر دیا جائے جو اہلِ مغرب کے بورژوا طبقہ نے اپنی خود غرضی و انتہا پسندی کی بنا پر ان میں شامل کر دیا تھا۔ پھر وہاں "خرابی کے اسباب" جو ہم نے بیان کیئے ہیں۔ آپ تسلیم کریں گے درحقیقت وہی خرابی کے اصل اسباب ہیں جنھیں اگر دور کر دیا جائے تو انسانی معیشت کا نظام اپنی فطری بنیادوں پر بہت اچھی طرح چل سکتا ہے بغیر اس کے کہ اس میں سرمایہ داری نظام کی برائیاں پیدا ہوں اور ان کے علاج کی مصنوعی تدبیریں اختیار کرنی پڑیں۔

ٹھیک یہی طریق کار ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ وہ "بے قید معیشت" کو "آزاد معیشت" میں تبدیل کر دیتا ہے، اور اس آزادی کو اُسی طرح چند حدود کا پابند بناتا ہے جس طرح تمدن و معاشرت کے تمام دوسرے شعبوں میں انسانی آزادی کو محدود کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ایسے تمام دروازے بند کر دیتا ہے جن سے آزاد معیشت میں ظالمانہ سرمایہ داری کی خصوصیات اور اثرات و نتائج پیدا ہونے کا امکان ہو۔ آیئے اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ دیکھیں کہ اسلام کے ان اصولوں پر معیشت کا کیا نقشہ بنتا ہے۔

(۱) اسلام تمام دوسری ملکیتوں کی طرح زمین پر بھی انسان کی شخصی ملکیت تسلیم کرتا ہے۔ جتنی قانونی شکلیں ایک چیز پر کسی شخص کی ملکیت قائم و ثابت ہونے کے لئے مقرر ہیں اُن ساری شکلوں کے مطابق زمین بھی اسی طرح ایک آدمی کی ملکیت ہو سکتی ہے جس طرح کوئی دوسری چیز۔ اس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ ایک گز مربع سے لے کر ہزارہا ایکڑ تک، خواہ کتنی ہی زمین ہو، اگر کسی قانونی صورت سے آدمی کی ملک میں آئی ہے

تو بہرحال وہ اسکی جائز ملک ہے۔ اس کے لئے خود کاشت کرنے کی قید بھی نہیں ہے۔ جس طرح مکان اور فرنیچر کرائے پر دیا جاسکتا ہے، سواری کرائے پر چلائی جاسکتی ہے، اسی طرح زمین بھی کرائے پر دی جاسکتی ہے۔ بلاکرایہ کوئی شخص کسی کو دے تو یہ صدقہ ہے۔ مگر کرایہ ولگان یا بٹائی پر معاملہ طے کرے تو یہ ویسا ہی ایک جائز فعل ہے جیسے تجارت میں حصہ داری۔ زمین "نظام جاگیرداری" کی وہ خرابیاں جو ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں، تو نہ وہ خالص زمینداری کی پیداوار ہیں اور نہ ان کا علاج یہ ہے کہ سرے سے زمین کی شخصی ملکیت ہی اڑا دی جائے، یا اس پر وہ مصنوعی حد بندیاں عائد کی جائیں جو زرعی اصلاحات" کے نام سے آج کل کے نیم حکیم تجویز کر رہے ہیں۔ بلکہ اسلامی اصول پر ان کا علاج دراصل یہ ہے کہ:

زمین کی خرید وفروخت پر سے تمام پابندیاں اٹھادی جائیں اور اس کا لین دین بالکل اسی طرح کھلے طور پر ہو جس طرح دنیا کی دوسری چیزوں کا ہوتا ہے۔

زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ طبقوں کی مستقل تفریق ہر شکل اور ہر حیثیت سے قطعی ختم کردی جائے۔

وہ مخصوص امتیازی حقوق بھی ازروئے قانون منسوخ کردیئے جائیں جو ہماری دیہاتی زندگی میں مالکان زمین کو حاصل ہیں۔

مالک زمین اور کاشتکار کے درمیان حقوق وفرائض ازروئے قانون مقرر کردیئے جائیں اور ان مقررہ حقوق کے ماسوا کسی دوسری قسم کے حقوق مالکان زمین کو اپنے مزارعین پر حاصل نہ ہوں۔

میراث کے معاملہ میں تمام رسوم جاہلیت کا خاتمہ کردیا جائے۔ زمینداروں کی موجودہ املاک شرعی طریقے پر ان کے زندہ وارثوں کے درمیان تقسیم کردی جائیں۔ اور آئندہ کے لئے اسلام کا قانون میراث ٹھیک ٹھیک نافذ کیا جائے۔

زمین بیکار ڈال رکھنے پر پابندی عائد کردی جائے۔ مثلاً یہ کہ جو زمینیں حکومت نے آبادکاری کے لئے دی ہوں وہ اگر تین سال سے زیادہ مدت تک بیکار ڈال رکھی جائیں گی تو عطیہ منسوخ ہوجائے گا۔ اور جو مملوکہ زمینیں افتادہ چھوڑ رکھی جائیں گی ان پر ایک خاص مدت کے بعد ٹیکس لگا دیا جائے گا۔

زمینداروں اور کاشتکاروں سے ان کی پیداوار کا ایک مخصوص حصہ اُن مقاصد کے لئے الگ لے لیا جائے

جن کا ذکر آگے نمبر (۴) میں آرہا ہے۔

نئے سائنٹفک طریقوں سے اگر بڑے پیمانے کی کاشت کرنی ہو تو اس کے لئے امداد باہمی کے ایسے ادارے قائم کیے جائیں جن میں چھوٹے چھوٹے مالکان زمین اپنے مالکانہ حقوق قائم رکھتے ہوئے آپس کی رضامندی سے اپنی املاک کو ایک بڑے کھیت میں تبدیل کرلیں اور مل جل کر ایک انجمن کی طرح اس کے سارے کاروبار چلائیں۔

کیا ان اصلاحات کے بعد زمینداری میں کوئی ایسی خرابی باقی رہ جاتی ہے جس کی معقولیت کے ساتھ نشان دہی کی جاسکتی ہو[1]؟

(۳) اسلام اشیاء استعمال اور ذرائع پیداوار کے درمیان اس طرح کا کوئی فرق تسلیم نہیں کرتا کہ ایک پر شخصی ملکیت جائز ہو اور دوسرے پر نہ ہو۔ اس کے نزدیک یہ بات بالکل جائز ہے کہ ایک آدمی دوسرے لوگوں کے لئے ان کی ضروریات زندگی میں سے کوئی چیز تیار یا فراہم کرے اور اسے ان کے ہاتھ فروخت کرے۔ یہ کام وہ خود اپنے ہاتھ سے بھی کرسکتا ہے اور دوسروں سے اجرت پر لے بھی سکتا ہے۔ ایسے سامان کی تیاری یا فراہمی میں، وہ جس مواد خام کو، جن آلات کو اور جس کارگاہ کو استعمال کرے، ان سب کا وہ مالک ہوسکتا ہے۔ یہ سب کچھ جس طرح صنعتی انقلاب کے دور سے پہلے جائز تھا اسی طرح اس دور میں بھی جائز ہے۔ مگر بے قید صنعت و تجارت نہ پہلے صحیح تھی اور نہ اب صحیح ہے۔ اسلامی اصول پر اسے حسب ذیل قواعد کا پابند بنانا ضروری تھا اور ہے۔

کسی ایسی فنی ایجاد کو، جو انسانی طاقت کی جگہ مشینی طاقت سے کام لیتی ہو، صنعت و حرفت اور کاروبار میں استعمال کرنے کی اس وقت تک اجازت نہ دی جائے جب تک اس امر کا اچھی طرح جائزہ نہ لے لیا جائے کہ وہ کتنے انسانوں کی روزی پر اثر ڈالے گی، اور یہ اطمینان نہ کرلیا جائے کہ ان متاثر ہونے والے لوگوں کی معیشت کا کیا بندوبست ہوگا۔

اجیروں اور مستاجروں کے درمیان حقوق اور فرائض اور شرائط کار کا تفصیلی تعین تو بہرحال فریقین ہی کی باہمی قرارداد پر چھوڑا جائیگا مگر ریاست اس معاملہ میں انصاف کے ساتھ چند اصول لازماً طے کردے۔ مثلاً ایک کارکن

---

[1] زمین اور اس کے انتظام کے بارے میں اسلامی احکام کا ایک مجموعہ انشاءاللہ عنقریب مرتب کردیا جائے گا جس سے اس اجمال کی تفصیل معلوم ہوجائے گی۔

کے لئے کم سے کم تنخواہ یا مزدوری کا معیار، زیادہ سے زیادہ اوقات کار کی حد، بیماری کی حالت میں علاج کے اور جسمانی نقصان کی صورت میں تلافی کے اور ناقابل کار ہو جانے کی حالت میں پنشن کے کم سے کم حقوق طے پالینے ہی، دوسرے امور۔

اجیر و مستاجر کی نزاعات کا تصفیہ حکومت اپنے ذمہ لے اور اس کے لئے باہمی مفاہمت، ثالثی، اور عدالت کا ایک ایسا ضابطہ مقرر کردے جس کی وجہ سے ہڑتالوں اور در بندیوں (Lockouts) کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔

کاروبار میں احتکار[1] (Hoarding)، سٹے (Speculation)، تجارتی قماربازی، اور غائب سودوں کی قطعی ممانعت کردی جائے، اور ان تمام طریقوں کو از روئے قانون بند کیا جائے جن سے قیمتوں پر ایک مصنوعی آماس چڑھتا ہے[2]۔

پیداوار کو قصداً برباد کرنا جرم قرار دیا جائے۔

صنعت اور تجارت کا ہر شعبہ حتی الامکان مسابقت کے لئے کھلا رہے اور اجارہ داریوں سے کسی شخص یا گروہ کو ایسے امتیازی حقوق دل جائیں جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہوں۔

ایسی صنعتوں اور تجارتوں کی اجازت نہ ہو جو عامۃ الناس کے اخلاق یا صحت پر برا اثر ڈالتی ہوں۔ اس طرح کی کوئی چیز اگر کسی پہلو سے ضروری ہو تو اسکی صنعت و تجارت پر تابحد ضرورت پابندیاں عاید کیجائیں۔

حکومت نازی طریقہ پر صنعت و تجارت کو بالکل اپنے تسلط (Control) میں تو نہ لے، مگر رہنمائی اور توفیق (Co-ordination) کی خدمت لازماً انجام دیتی رہے تاکہ ملک کی صنعت و تجارت غلط راستوں پر بھی نہ جانے پائے، اور معاشی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہم آہنگی بھی پیدا ہو سکے۔

اسلامی قانون میراث کے ذریعہ سے زمینداروں کی طرح صناعوں اور کاروباری لوگوں کی سمٹی ہوئی دولت

---

[1] یعنی اشیاء ضرورت کے ذخائر کو سمیٹ سمیٹ کر فروخت سے روک رکھنا تاکہ ان کی قیمتیں چڑھ جائیں۔

[2] اسلامی شریعت کا تجارتی قانون درحقیقت معاشی زندگی کی اصلاح کا ایک بڑا اہم باب ہے جس سے دنیا نے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ خود مسلمانوں نے بھی اس سے مجرمانہ غفلت برتی ہے۔ یہاں اس قانون کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ انشاء اللہ عنقریب ایک مستقل رسالہ خاص اس موضوع پر مرتب کردیا جائے گا۔ اس مقام پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ کاروبار کے ان غلط طریقوں کو از روئے قانون بند ہونا چاہیئے جو اجتماعی مفاد کے لئے نقصان دہ ہیں۔

بھی پیہم تقسیم ہوتی رہے تاکہ مستقل دولت مند طبقے نہ بننے پائیں۔

اہل زراعت کی طرح تاجروں اور صناعوں اور کاروباری لوگوں سے بھی ان کی آمدنیوں کا ایک حصہ اُن مقاصد کے لئے لازماً لیا جائے جن کا ذکر آگے نمبر (۴) میں آرہا ہے۔

(۳) مالیات میں اسلام افراد کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ ان کی آمدنیوں کا جو حصہ ان کی ضروریات سے بچ رہے، اسے جمع کریں، یا دوسروں کو قرض دیں، یا خود کسی کاروبار میں لگائیں، یا کسی صنعت و تجارت میں اپنا سرمایہ دیکر اس کے نفع و نقصان میں حصہ دار بن جائیں۔ اگرچہ اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ تو یہی ہے کہ لوگ اپنی فاضل آمدنیوں کو نیک کاموں میں خرچ کردیا کریں، لیکن وہ مذکورۂ بالا چاروں طریقوں کو بھی جائز رکھتا ہے، بشرطیکہ وہ حسب ذیل قواعد کے پابند ہوں۔

جمع کرنے کی صورت میں وہ اس جمع شدہ دولت کا ۲ ½ فی صدی سالانہ حصہ لازماً اُن کاموں کے لئے دیتے رہیں جن کا ذکر آگے نمبر (۴) میں آرہا ہے، اور جب وہ مریں تو ان کا پورا سرمایہ اسلامی قانون میراث کے مطابق ان کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے۔

قرض دینے کی صورت میں وہ صرف اپنا دیا ہوا سرمایہ ہی واپس لے سکتے ہیں۔ کسی حالت میں سود کے مستحق وہ نہیں ہیں، خواہ قرض لینے والے نے اپنے ذاتی مصارف میں صرف کرنے کے لئے قرض لیا ہو یا کسی صنعت و تجارت میں لگانے کے لئے۔ اسی طرح وہ اس امر کا حق بھی نہیں رکھتے کہ اگر اپنے دیئے ہوئے مال کی واپسی کا اطمینان کرنے کے لئے انہوں نے مدیون سے کوئی زمین یا جائداد رہن کے طور پر لی ہو تو وہ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھائیں۔ فائدہ بہر حال سود ہے اور وہ کسی شکل میں بھی نہیں لیا جا سکتا۔ علیٰ ہذا القیاس یہ بھی جائز نہیں ہے کہ نقد خریداری کی صورت میں ایک مال کی قیمت کچھ ہو اور قرض پر خریدنے کی صورت میں اس سے زیادہ ہو۔

صنعت و تجارت یا زراعت میں براہ راست خود سرمایہ لگانے کی صورت میں ان کو اُن قواعد کا پابند ہونا پڑے گا جو نمبر (۱) اور (۲) میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

حصہ داری کی صورت میں ان کو لازماً نفع اور نقصان میں یکساں شریک ہونا پڑے گا، اور وہ ایک

طے شدہ تناسب کے مطابق دونوں میں حصہ دار ہوں گے۔ شرکت کی کوئی ایسی صورت قانوناً جائز نہ ہوگی جس کی رو سے سرمایہ دینے والا صرف نفع میں شریک ہو، اور مقرر شرح منافع کا لازماً حق دار قرار پائے۔

(۴) اسلام معاشرے اور ریاست کے ذمہ یہ فرض عائد نہیں کرتا کہ وہ اپنے افراد کو روزگار فراہم کرے، اس لئے کہ فراہمی روزگار کی ذمہ داری بغیر اس کے نہیں لی جاسکتی کہ ذرائع پیداوار پر اجتماعی قبضہ یا کم از کم نازی طرز کا تسلط ہو، اور اسکی غلطی و مضرّت پہلے بتائی جا چکی ہے۔ لیکن اسلام اسکو بھی صحیح نہیں سمجھتا کہ اجتماعی زندگی میں افراد کو بالکل ان کے اپنے ہی ذرائع اور اپنے ہی حالات پر چھوڑ دیا جائے اور آفت رسیدہ لوگوں کی خبر گیری کا کوئی بھی ذمہ دار نہ ہو۔ وہ ایک طرف ہر انسان پر فرداً فرداً یہ اخلاقی فریضہ عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے اور پرائے، جس فرد بشر کو بھی مدد کا محتاج پائے اسکی مدد اپنی حد استطاعت تک ضرور کرے۔ دوسری طرف وہ صناعوں، تاجروں اور زمینداروں سے بھی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں جن لوگوں سے وہ کام لیتے ہیں ان کے حقوق کو ٹھیک ٹھیک ادا کریں۔ اور اس سب پر مزید یہ کہ وہ پورے معاشرے اور ریاست پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ اس کے حدود عمل کے اندر رہنے والا کوئی شخص کم سے کم ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ معاشرے کے اندر جو لوگ بے روزگار ہو جائیں، یا کسی عارضی سبب سے ناقابل کار ہوں، یا کسی مستقل وجہ سے ناکارہ ہو جائیں، یا کسی حادثے اور آفت کے شکار ہوں، ان سب کو سہارا دینا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ وہ بچے جن کا کوئی سر پرست نہیں، ان کی سرپرستی کرنا ریاست کا فریضہ ہے۔ وہ بیمار جو دوا اور علاج کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے، ان کا علاج ریاست کے ذمہ ہے۔ جو پیٹ خالی ہے اسے بھرنا ریاست کا کام ہے اور جو تن ننگا ہے اسے کپڑا دینا ریاست کا فرض ہے۔ حد یہ ہے کہ جو شخص قرض دار ہو اور اپنا قرض ادا نہ کر سکے اس کا قرض بھی بالآخر ریاست پر جا پڑتا ہے۔ یہ سوشل انشورنس کی ایک وسیع ترین اسکیم ہے جو براہ راست ریاست کے انتظام میں روبعمل آنی چاہیے۔ اس کے لئے مالی وسائل کی فراہمی کا انتظام اسلام حسب ذیل طریقہ پر تجویز کرتا ہے۔

ہر شخص جس نے ایک مقرر مدّ نصاب سے زائد سرمایہ جمع کر رکھا ہو، اپنے سرمایہ کا ۲½ فی صدی حصّہ سالانہ زکوٰۃ میں دے۔

ہر زمیندار و کاشتکار اپنی بارانی زمینوں کی پیداوار کا ۱۰ فیصدی اور چاہی و نہری زمینوں کی پیداوار کا ۵ فی صدی حصہ اِس مد میں ادا کرے۔

ہر صناع اور تاجر اپنی سالانہ آمدنی کا (صناع کا نہیں بلکہ آمدنی کا) ۲½ فی صدی حصہ دے۔

ہر گلہ بان جو ایک خاص مقدار نصاب سے زائد مویشی رکھتا ہو، ایک خاص تناسب کے مطابق اپنی حیوانی دولت کا ایک حصہ ہر سال حکومت کے حوالہ کر دے۔

معدنیات اور دفینوں میں سے بھی خُمس لیا جائے۔

اور کوئی جنگ پیش آئے تو اموال غنیمت میں سے بھی ۲۰ فیصدی حصہ اِن اغراض کے لیے الگ کر لیا جائے۔

یہ پوری دولت اُن مصارف کے لیے وقف ہوگی جو قرآن مجید میں زکوٰۃ اور خُمس کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، جن کا ایک جزوِ اعظم سوشل انشورنس کی وہ اسکیم ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۱۔

(۵) اسلام اِس بات کو اصولاً پسند نہیں کرتا کہ حکومت خود صناع یا تاجر یا زمیندار بنے۔ اس کے نزدیک حکومت کا کام رہنمائی ہے، قیام عدل ہے، مفاسد کی روک تھام ہے، اور اجتماعی فلاح کی خدمت ہے، مگر سیاسی طاقت کے ساتھ سوداگری کو جمع کرنے کی قباحتیں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ اِس کے چند ظاہری فوائد کی خاطر اُن کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ صرف ایسی صنعتوں اور ایسے کاروبار کو حکومت کے انتظام میں چلانا جائز رکھتا ہے جو قومی زندگی کے لیے ضروری تو ہوں، مگر یا تو افراد انہیں چلانے کے لیے خود تیار نہ ہوں، یا انفرادی ہاتھوں میں ان کا رہنا بالواضح اجتماعی مفاد کے لیے نقصان دہ ہو۔ اس قسم کے کاموں کے ماسوا دوسرے صنعتی و تجارتی کام اگر ملک کی ترقی و بہبود کی خاطر حکومت خود شروع کرے بھی تو اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ایک خاص حد تک کامیابی کے ساتھ چلانے کے بعد وہ اس کاروبار کو انفرادی ہاتھوں میں منتقل کر دے۔

یہ حدود و ضوابط اور یہ اصلاحی تدبیریں اگر معیشت کے اُن سات فطری اصولوں کے ساتھ جمع کر دی جائیں جو جدید نظام سرمایہ داری" کے باب میں ہم بیان کر چکے ہیں، تو اس سے جاگیرداری و سرمایہ داری کی تمام خرابیوں کا سدِ باب ہو جاتا ہے اور ایک ایسا متوازن نظام معیشت بن جاتا ہے جس میں انفرادی آزادی

۱ زکوٰۃ اور خمس کے جن مسائل کا یہاں اشارۃً ذکر کیا گیا ہے ان پر تفصیلی معلومات انشاء اللہ ایک مستقل رسالہ میں مرتب کر دی جائیں گی۔

اور اجتماعی فلاح، دونوں ٹھیک ٹھیک عدل کے ساتھ سموئے جا سکتے ہیں، بغیر اس کے کہ موجودہ صنعتی انقلاب کی رفتار ترقی میں ذرہ برابر بھی خلل آنے پائے۔[1]

[1] یہاں اُن مباحث کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں بیان ہو چکے ہیں۔ اسلامی نظام معیشت پر جامع نظر حاصل کرنے کے لیے اس کتاب کا باب پنجم (اسلامی نظم معیشت اور اس کے ارکان) نگاہ میں رہنا ضروری ہے نیز اس کے ساتھ میرا مقالہ انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" اور میری نشری تقریروں کا مجموعہ "اسلام کا نظام حیات" بھی پیش نظر رہے تو بہتر ہے۔

(۶)

حرمتِ سود (سلبی پہلو)

متوازن معیشت کا جو نقشہ پچھلے باب میں پیش کیا گیا ہے اس کے بنیادی ستون چار ہیں:

(۱) آزاد معیشت چند قانونی اور انتظامی حدود و قیود کے اندر،

(۲) زکوٰۃ کی فرضیت،

(۳) سود کی حرمت،

(۴) قانونِ میراث۔

ان میں سے پہلے رکن کو کم از کم اصولی طور پر وہ سب لوگ اب درست تسلیم کرنے لگے ہیں جن کے سامنے بے قید سرمایہ داری کی قباحتیں اور اشتراکیت و فاشیت کی شناعتیں بے نقاب ہو چکی ہیں۔ البتہ اسکی تفصیلات کے بارے میں کچھ الجھنیں ذہنوں میں پائی جاتی ہیں جو بغیر اس کے دور نہیں ہو سکتیں کہ اسلام کے زرعی اور تجارتی قوانین مفصل طور پر مرتب کر دیئے جائیں۔ یہ چیز ہماری اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے، مگر ہم کوشش کریں گے کہ جلدی سے جلدی یہ خدمت بھی انجام پا جائے۔

زکوٰۃ کی اہمیت اب بڑی حد تک دنیا کے سامنے واضح ہو چکی ہے، اور کسی صاحب نظر سے یہ بات مخفی نہیں رہی ہے کہ اشتراکیت، فاشزم اور سرمایہ دارانہ جمہوریت، تینوں نے اب تک سوشل انشورنس کا جو وسیع سے وسیع نظام سوچا ہے، زکوٰۃ اس سے بہت زیادہ وسیع پیمانے پر اجتماعی انشورنس کا انتظام کرتی ہے لیکن یہاں بھی کچھ الجھنیں زکوٰۃ کے تفصیلی احکام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔ اور لوگوں کے لئے یہ بات سمجھنی بھی مشکل ہو رہی ہے کہ ایک جدید ریاست کے مالیات میں زکوٰۃ و خمس کو کس طرح نصب کیا جا سکتا ہے۔ اس چیز پر بھی انشاء اللہ ایک الگ رسالے میں بحث کی جائے گی۔

قانونِ میراث کے بارے میں اسلام نے تمام دنیا کے قوانینِ وراثت سے ہٹ کر جو مسلک اختیار کیا ہے، پہلے اسکی حکمتوں سے بکثرت لوگ ناواقف تھے اور طرح طرح کے اعتراضات اس پر کرتے تھے۔ لیکن اب

بتدریج ساری دنیا اسکی طرف رجوع کرتی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ روسی اشتراکیت کو بھی اسکی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے[1]

سب سے بڑھ کر اِس نقشے کے جس رکن کو سمجھنے میں موجودہ زمانے کے لوگوں کو زحمت پیش آ رہی ہے وہ تحریم سود ہے۔ اوّل تو پورا علم معیشت نے پچھلی صدیوں میں یہ تخیل بڑی گہری جڑوں کے ساتھ جما دیا ہے کہ سود کی حرمت محض ایک جذباتی چیز ہے، اور یہ کہ بلا سود کسی شخص کو قرض دینا محض ایک اخلاقی رعایت ہے جس کا مطالبہ مذہب نے خواہ مخواہ اس قدر مبالغہ کے ساتھ کر دیا ہے ورنہ منطقی حیثیت سے سود سراسر ایک معقول چیز ہے، اور معاشی حیثیت سے وہ صرف ناقابل اعتراض ہی نہیں بلکہ عملاً مفید اور ضروری بھی ہے پھر ایک بڑی غلط فہمی شکست خوردہ اہل مذہب میں یہ پھیل گئی ہے کہ سود کوئی قابل اعتراض چیز اگر ہے بھی تو صرف اُس صورت میں جب کہ وہ اُن لوگوں سے وصول کیا جائے جو اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لئے قرض لیتے ہیں، رہے وہ قرضے جو کاروبار میں لگانے کے لئے حاصل کیے گئے ہوں، تو ان پر سود کا لین دین سراسر جائز و معقول اور حلال و طیب ہے، اور اس میں دین، اخلاق، عقل اور اصولِ علم معیشت کسی چیز کے اعتبار سے بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس پر مزید وہ خوش فہمیاں ہیں جن کی بنا پر قدیم طرز کے بنیوں اور مہاجنوں کی سود خواری سے موجودہ زمانہ کے بنکنگ کو ایک مختلف چیز سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان بینکوں کا سُتھرا کاروبار تو بالکل ایک پاکیزہ چیز ہے جس سے ہر قسم کا تعلق رکھا جا سکتا ہے۔ ان تمام مغالطوں کے چکر سے جو لوگ نکل گئے ہیں وہ بھی یہ سمجھنے میں مشکل محسوس کر رہے ہیں کہ سود کو قانوناً بند کر دینے کے بعد موجودہ زمانہ میں مالیات کا نظم کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم انہی مسائل کو صاف کرنے کی کوشش کریں گے۔

---

[1] سوویٹ روس کے تازہ ترین قانونِ وراثت میں اولاد، بیوی، شوہر، والدین، بھائیوں، بہنوں، اور متبنیٰ کو وارث ٹھہرایا گیا ہے۔ نیز یہ قاعدہ بھی مقرر کیا گیا ہے کہ آدمی اپنا ترکہ اپنے حاجت مند قریبی رشتہ داروں اور پبلک اداروں میں تقسیم کرنے کی وصیت کر سکتا ہے مگر رشتہ داروں کا حق مقدم ہے۔ اس کے ساتھ ایسی وصیت ممنوع ٹھیرائی گئی ہے جس کا مقصود نابالغ اولاد یا غریب وارثوں کو حق وراثت سے محروم کرنا ہو۔ اس قانون کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اشتراکی ترقی پسندوں" نے ۴۵ ۱۹ میں اُس قانون کی طرف رجعت فرمائی ہے جو ۲۶-۱۹۲۵ میں بنایا گیا تھا۔

سود کی عقلی توجیہات سب سے پہلے جس بات کو طے ہونا چاہیئے وہ یہ ہے کہ کیا فی الواقع سود ایک معقول چیز ہے؟ کیا درحقیقت عقل کی رو سے ایک شخص اپنے دیئے ہوئے قرض پر سود کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے؟ اور کیا انصاف یہی چاہتا ہے کہ جو شخص کسی سے قرض لے وہ اسکو اصل کے علاوہ کچھ نہ کچھ سود بھی دے؟ یہ اس بحث کا اولین سوال ہے اور اس کے طے ہو لینے سے آدھی سے زیادہ بحث آپ سے آپ طے ہو جاتی ہے کیونکہ اگر سود ایک معقول چیز ہے تو پھر تحریم سود کے مقدمے میں کوئی جان باقی نہیں رہتی۔ اور اگر سود کو عقل و انصاف کی رو سے درست ثابت نہیں کیا جا سکتا تو پھر یہ امر غور طلب ہو جاتا ہے کہ انسانی معاشرے میں اس نامعقول چیز کو باقی رکھنے پر آخر کیوں اصرار کیا جائے۔

توجیہ اول اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے جس دلیل سے ہم کو سابقہ پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کو اپنا پس انداز کیا ہوا مال قرض دیتا ہے وہ خطرہ مول لیتا ہے، ایثار کرتا ہے، اپنی ضرورت روک کر دوسرے کی ضرورت پوری کرتا ہے، جس مال سے وہ خود فائدہ اٹھا سکتا تھا اسے دوسرے کے حوالہ کرتا ہے۔ قرض لینے والے نے اگر قرض اس لئے لیا ہے کہ اپنی کوئی ذاتی ضرورت اس سے پوری کرے تو اسے اس مال کا کرایہ ادا کرنا چاہیئے جس طرح وہ مکان یا فرنیچر یا سواری کا کرایہ ادا کرتا ہے۔ یہ کرایہ اُس خطرے کا معاوضہ بھی ہوگا جو دائن نے اپنا مال اس کے حوالہ کرنے میں برداشت کیا، اور اس امر کا معاوضہ بھی ہوگا کہ دائن نے اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت خود استعمال کرنے کے بجائے اس کو استعمال کرنے کے لئے دے دی۔ اور اگر مدیون نے یہ قرض کسی نفع آور کام میں لگانے کے لئے لیا ہے تو پھر تو دائن اس پر سود مانگنے کا بدرجۂ اولٰی مستحق ہے۔ جب مدیون اسکی دی ہوئی دولت سے فائدہ اٹھا رہا ہے تو آخر دائن اس فائدے میں سے کیوں نہ حصہ پائے۔

اس توجیہ کا یہ حصہ بالکل درست ہے کہ قرض دینے والا اپنا مال دوسرے کے حوالہ کرنے میں خطرہ بھی مول لیتا ہے اور ایثار بھی کرتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کیسے نکل آیا کہ وہ اس خطرے اور اس ایثار کی ایک قیمت ۵، ۱۰ یا ۲۰ فی صدی سالانہ یا ششماہی یا ماہوار کے حساب سے وصول کرنے کا حق رکھتا ہے۔ خطرے کی بنیاد پر جو حقوق معقول طریقے سے اسکو پہنچتے ہیں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہیں کہ وہ مدیون کی کوئی چیز رہن

رکھ دے یا اسکی کسی چیز کی ضمانت پر قرض دے یا اس سے کوئی ضامن طلب کرے یا پھر سرے سے خطرہ ہی مول نہ لے اور قرض دینے سے انکار کر دے۔ مگر خطرہ تو کوئی مالِ تجارت ہے جس کی کوئی قیمت ہو اور نہ وہ کوئی مکان یا فرنیچر یا سواری ہے کہ اس کا کوئی کرایہ ہو سکے۔ رہا ایثار تو وہ اُسی وقت تک ایثار ہے جب تک کہ وہ کاروبار نہ ہو۔ آدمی کو ایثار کرنا ہو تو پھر ایثار ہی کرے اور اِس اخلاقی فعل کے اخلاقی فوائد پر راضی رہے۔ اور اگر وہ معاوضے کی بات کرتا ہے تو پھر ایثار کا ذکر نہ کرے بلکہ سیدھی طرح سوداگری کرے اور یہ بتائے کہ وہ قرض کے معاملہ میں اصل رقم کے علاوہ ایک مزید رقم ماہوار یا سالانہ کے حساب سے جو وصول کرتا ہے اس کا آخر وہ کس بنیاد پر مستحق ہے؟

کیا وہ ہرجانہ ہے؟ مگر جو رقم اس نے قرض دی ہے وہ اسکی ضرورت سے زائد تھی۔ اور اسے وہ خود استعمال بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس لئے یہاں فی الواقع کوئی "ہرج" واقع ہی نہیں ہوا کہ اپنے دیئے ہوئے اس قرض پر وہ کوئی "ہرجانہ" لینے کا مستحق ہو۔

کیا یہ کرایہ ہے؟ مگر کرایہ تو ان چیزوں کا ہوا کرتا ہے جنہیں کرایہ دار کے لئے مہیا کرنے اور درست رکھنے پر آدمی اپنا وقت، محنت اور مال صرف کرتا ہے اور جو کرایہ دار کے استعمال سے خراب ہوتی ہیں، ٹوٹتی پھوٹتی ہیں اور اپنی قیمت کھوتی رہتی ہیں۔ یہ تعریف اشیاء استعمال مثلاً مکان، فرنیچر اور سواری وغیرہ پر تو صادق آتی ہے، اور انہی کا کرایہ ایک معقول چیز ہے۔ لیکن اس تعریف کا اطلاق کسی طرح بھی اشیاء صرف (مثلاً گیہوں اور پھل)، یا روپے پر نہیں ہو سکتا، اس لئے ان کا کرایہ بالکل ایک بے معنی چیز ہے۔

زیادہ سے زیادہ وہ جو کچھ کہہ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ میں دوسرے شخص کو اپنے مال سے فائدہ اٹھانے کا موقع دے رہا ہوں لہٰذا مجھے اِس فائدے میں سے حصہ ملنا چاہیے۔ یہ البتہ ایک معقول بات ہے مگر سوال یہ ہے کہ جس فاقہ کش آدمی نے اپنے بھوکے بال بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے تم سے ۵ سیر گیہوں قرض لیے ہیں، یا جس نے اپنے بیمار بچے یا بیوی یا ماں کا علاج کرنے کے لئے تم سے ۵۰ روپے عاریۃً حاصل کیے ہیں، کیا واقعی وہ تمہارے دیئے ہوئے غلے یا روپے سے ایسا ہی "فائدہ" اٹھا رہا ہے جس میں سے تم ایک چھٹانک فی سیر یا ۲ روپے فی صد ماہوار کے حساب سے اپنا حصہ پانے کے مستحق ہو؟ فائدہ تو وہ بے شک اٹھا رہا ہے، اور اس استفادے کا موقع

بلاشبہ تم نے ہی اسے دیا ہے، لیکن عقل، انصاف، معاشی علم، کاروباری اصول، آخر کس چیز کی رو سے اس فائدے اور اس موقعِ استفادہ کی یہ نوعیت قرار پاتی ہے کہ تم اسکی ایک مالی قیمت مشخص کرو، اور قرض مانگنے والے کی مصیبت جتنی زیادہ سخت ہو اتنی ہی یہ قیمت بھی زیادہ ہو جائے، اور اسکی مصیبت زدگی کا زمانہ جتنا دراز ہوتا جائے تمہارے دیئے ہوئے اس "موقع استفادہ" کی قیمت بھی مہینوں اور برسوں کے حساب سے اس پر بڑھتی اور چڑھتی چلی جائے؟ تم اگر اتنا بڑا دل نہیں رکھتے کہ ایک حاجت مند اور آفت رسیدہ انسان کو اپنی ضرورت سے زائد بچا ہوا مال عطا کر دو، تو حد سے حد جو بات تمہارے لئے معقول ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنی رقم کی واپسی کا اطمینان کر کے اسے قرض دے دو۔ اور اگر تمہارے دل میں قرض دینے کی بھی گنجائش نہیں ہے تو بدرجۂ آخر یہ بھی ایک معقول بات ہو سکتی ہے کہ تم سرے سے اسکو کچھ نہ دو۔ مگر کاروبار اور تجارت کی یہ کونسی معقول صورت ہے کہ ایک شخص کی مصیبت اور تکلیف تمہارے لئے نفع اندوزی کا موقع ٹھہرے، بھوکے پیٹ اور جاں بلب مریض تمہارے لئے روپیہ لگانے (Investment) کی جگہ قرار پائیں، اور انسانی مصائب جتنے بڑھیں اتنے ہی تمہارے نفع کے امکانات بھی بڑھتے چلے جائیں!

"فائدہ اٹھانے کا موقع دینا" اگر کسی صورت میں کوئی مالی قیمت رکھتا ہے تو وہ صرف وہ صورت ہے جب کہ روپیہ لینے والا اسے کسی کاروبار میں لگا رہا ہو۔ اس صورت میں البتہ روپیہ دینے والا یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ مجھے اس فائدے میں سے حصہ ملنا چاہیئے جو میرے روپے سے دوسرا شخص اٹھا رہا ہے۔ لیکن جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا پس انداز کیا ہوا روپیہ کسی نفع آور کاروبار میں لگے اور کچھ فائدہ لائے اس کے لئے سیدھا اور معقول طریقہ یہ ہے کہ وہ قرض دینے کے بجائے کسی کاروباری آدمی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کرے اور نفع و نقصان میں ایک طے شدہ تناسب کے مطابق حصہ دار بن جائے۔ نفع کمانے کا یہ آخر کونسا معقول طریقہ ہے کہ میں ایک شخص کا شریک بننے کے بجائے اسے سو روپے قرض دوں اور اس سے کہوں کہ چونکہ تو اس رقم سے فائدہ اٹھائے گا اس لئے تجھ پر میرا یہ حق ہے کہ مجھے مثلاً ایک روپیہ ماہوار اس وقت تک دیتا رہ جب تک میرے یہ روپے تیرے کاروبار میں استعمال ہو رہے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ اگر وہ شخص کاروبار میں فائدے کے بجائے نقصان اٹھائے تو میں کس عقل و انصاف کی رو سے یہ ماہوار منافع اس سے وصول کرنے کا حق رکھتا ہوں؟ اور اگر اس کا منافع ایک روپیہ ماہوار سے کم رہے

تو مجھے ایک روپیہ ماہوار لینے کا کیا حق ہے؟ اور اگر اس کا کل منافع ایک ہی روپیہ ہو تو کونسا انصاف یہ جائز رکھتا ہے کہ جس شخص نے مہینہ بھر تک اپنا وقت، محنت، قابلیت اور ذاتی سرمایہ، سب کچھ صرف کیا وہ تو کچھ نہ پائے اور میں جو صرف سو روپے اسکو دے کر الگ ہو گیا تھا، اس کا سارا منافع لے اڑوں؟ ایک بیل بھی اگر تیلی کے لئے دن بھر کولھو چلاتا ہے تو کم از کم اس سے چارہ مانگنے کا حق تو ضرور رکھتا ہے۔ مگر یہ سودی قرض ایک کاروباری آدمی کو وہ بیل بنا دیتا ہے جسے کولھو تو دن بھر میرے لیئے چلانا چاہیئے اور چارہ کہیں اور سے کھانا چاہیئے!

پھر اگر بالفرض ایک کاروباری آدمی کا منافع اُس متعین رقم سے زائد بھی رہے جو قرض دینے والے نے سود کے طور پر اس کے ذمہ لگائی ہو، تب بھی عقل، انصاف، اصولِ تجارت، اور قانونِ معیشت، کسی چیز کی رو سے بھی اس بات کو معقول ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ تاجر، صناع، کاشتکار، اور دوسرے تمام وہ لوگ جو اصل عاملینِ پیدائش ہیں، جو سوسائٹی کی ضروریات تیار اور فراہم کرنے میں اپنے اوقات صرف کرتے ہیں، محنتیں برداشت کرتے ہیں، دماغ لڑاتے ہیں، اور اپنے جسم و ذہن کی ساری قوتیں کھپا دیتے ہیں، اُن سب کا فائدہ تو مشتبہ اور غیر معیّن ہو مگر صرف اُس ایک آدمی کا فائدہ یقینی اور معیّن ہو جس نے اپنی پس انداز کی ہوئی رقم قرض دے دی ہے؟ اُن سب کے لئے تو نقصان کا خطرہ بھی ہو مگر اس کے لیئے خالص نفع کی گارنٹی ہو؟ اُن سب کے نفع کی شرح بازار کی قیمتوں کے ساتھ گرتی اور چڑھتی رہے، مگر یہ ایک اللہ کا بندہ جو نفع اپنے لیئے طے کر چکا ہے وہ اسے جوں کا توں ماہ بماہ اور سال بسال ملتا رہے؟[1]

توجیہ دوم | اس تنقید سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بادی النظر میں سود کو ایک معقول چیز قرار دینے کے لئے جو دلائل کافی سمجھ لیئے جاتے ہیں، ذرا گہرائی میں جاتے ہی ان کی کمزوری کھلنی شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں تک اُس قرض کا تعلق ہے جو شخصی حاجات کے لیئے لیا جاتا ہے، اس پر سود عائد ہونے کے لئے تو سرے سے کوئی عقلی دلیل

---

[1] اس مقام پر ایک شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ پھر تم زمین کے لگان کو کس طرح جائز ٹھہراتے ہو جب کہ اسکی پوزیشن بھی بعینہٖ سود کی سی ہے؟ مگر درحقیقت یہ اعتراض صرف اُن لوگوں پر وارد ہوتا ہے جو زمین کے نقد لگان، مثلاً ۲۰ روپیہ بیگھہ یا ۵۰ روپیہ ایکڑ کے حساب سے پیشگی معین کر لینے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ میں اس چیز کا قائل نہیں ہوں، بلکہ میں خود بھی اسے سود سے مشابہ سمجھتا ہوں، اس لیئے اس اعتراض کا جواب میرے ذمہ نہیں ہے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ مالک زمین اور کاشتکار کے درمیان معاملہ کی صحیح صورت صرف بٹائی ہے، یعنی یہ کہ جتنی پیداوار ہوگی اس کا اِتنا حصہ زمیندار کا اور اتنا کاشتکار کا۔ یہ معاملہ

۴ تجارتی حصہ داری سے مشابہ ہے اور اسکو میں جائز سمجھتا ہوں۔

موجود ہی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ حامیانِ سود نے خود ہی اس کمزور مقدمے سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ رہا وہ قرض جو کاروباری اغراض کے لئے لیا جاتا ہے، تو اس کے بارے میں بھی حامیانِ سود کو اس پیچیدہ سوال سے سابقہ پیش آتا ہے کہ سود آخر کس چیز کی قیمت ہے؟ ایک دائن اپنے سرمایہ کے ساتھ مدیون کو وہ کونسی جوہری (Substantial) چیز دیتا ہے جس کی ایک مالی قیمت، اور وہ بھی ماہ بماہ و سال بسال ادا شدنی قیمت مانگنے کا اسے حق پہنچتا ہو؟

اس چیز کے تشخص کرنے میں حامیانِ سود کو خاصی پریشانی پیش آئی ہے۔ ایک گروہ نے کہا کہ وہ "فائدہ اٹھانے کا موقع" ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر کی تنقید سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے، "یہ موقع" کسی متعین اور یقینی اور لازماً افزوں قیمت کا استحقاق پیدا نہیں کرتا، بلکہ صرف اس صورت میں ایک متناسب نفع کا استحقاق پیدا کرتا ہے جب کہ فی الواقع روپیہ لینے والے کو نفع ہو۔ دوسرا گروہ تھوڑی سی پوزیشن تبدیل کر کے کہتا ہے کہ وہ چیز "مہلت" ہے جو دائن اپنے سرمایہ کے ساتھ اس کے استعمال کے لئے مدیون کو دیتا ہے۔ یہ مہلت بجائے خود اپنی ایک قیمت رکھتی ہے اور جس قدر دراز ہوتی جائے اس کی قیمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جس روز آدمی روپیہ لے کر کام میں لگاتا ہے، اس روز سے لے کر اس دن تک جب کہ اس سرمایہ کے ذریعہ سے تیار کیا ہوا مال بازار میں پہنچے اور قیمت لائے، ایک ایک لمحہ کاروباری آدمی کے لئے قیمتی ہے۔ یہ مہلت اگر اسے نہ ملے اور بیچ ہی میں سرمایہ اس سے واپس لے لیا جائے تو سرے سے اس کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا یہ وقت روپیہ لے کر لگانے والے کے لئے یقیناً ایک قیمت رکھتا ہے جس سے وہ فائدہ اٹھا رہا ہے، پھر کیوں نہ روپیہ دینے والا اس فائدہ میں سے حصہ لے؟ اور اس وقت کی کمی و بیشی کے ساتھ مدیون کے لئے نفع کے امکانات بھی لامحالہ کم و بیش ہوتے ہیں، پھر کیوں نہ دائن وقت ہی کی درازی و کوتاہی کے لحاظ ہی سے اس کی قیمت مشخص کرے؟

مگر یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر روپیہ دینے والے کو کس ذریعۂ علم سے یہ معلوم ہو گیا کہ جو شخص کام میں لگانے کے لئے اس سے روپیہ لے رہا ہے وہ ضرور نفع ہی حاصل کرے گا، نقصان سے دوچار نہ ہوگا؟ اور پھر یہ اس نے کیسے جانا کہ اس کا نفع بھی لازماً اس قدر فی صدی رہے گا، لہٰذا ضرور اتنے فی صدی [illegible] روپیہ دینے والے کا حصہ ادا کرنا چاہیئے اور پھر اس کے پاس یہ حساب لگانے کا آخر کیا ذریعہ ہے کہ وہ وقت جس کے دوران میں

وہ مدیون کو اپنے روپیہ کے استعمال کی مہلت دے رہا ہے لازماً ہر مہینے اور ہر سال اتنا نفع لاتا رہے گا لہٰذا ضروری اسکی ماہوار و سالانہ قیمت یہ قرار پانی چاہیئے؟ اِن سوالات کا کوئی معقول جواب حامیانِ سود کے پاس نہیں ہے۔ اس لئے بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ کاروباری معاملات میں اگر کوئی چیز معقول ہے تو وہ صرف نفع و نقصان کی شرکت اور متناسب حصہ داری ہے نہ کہ سود جو ایک متعین شرح کے ساتھ عائد کر دیا جائے۔

توجیہ سوم | ایک اور گروہ کہتا ہے کہ نفع آوری سرمایہ کی ذاتی صفت ہے، لہٰذا ایک شخص کا دوسرے کے فراہم کردہ سرمایہ کو استعمال کرنا بجائے خود اس امر کا استحقاق پیدا کرتا ہے کہ وہ ان سود مانگے اور مدیون اسے ادا کرے۔ سرمایہ یہ قوت رکھتا ہے کہ اشیاء ضرورت کی تیاری وفراہمی میں مددگار ہو۔ سرمایہ کی مدد سے اتنا سامان تیار ہوتا ہے جتنا اسکی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ کی مدد شامل حال ہونے سے زیادہ مقدار میں زیادہ اچھا مال تیار ہوتا ہے اور اچھی قیمت دینے والی منڈیوں تک پہنچ سکتا ہے، ورنہ کم اور گھٹیا مال تیار ہوتا ہے اور ایسے مواقع پر نہیں پہنچ سکتا جہاں زیادہ قیمت مل سکے۔ یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ نفع آوری ایک ایسی صفت ہے جو سرمایہ کی ذات میں ودیعت کر دی گئی ہے، لہٰذا مجرد اس کا استعمال ہی سود کا استحقاق پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن اول تو یہ دعویٰ ہی بداہتہً غلط ہے کہ سرمایہ میں "نفع آوری" نام کی کوئی ذاتی صفت پائی جاتی ہے۔ یہ صفت تو اس میں صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ آدمی اسے لے کر کسی مثمر کام میں لگائے۔ صرف اسی صورت میں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ روپیہ لینے والا چونکہ اس سے ایک نافع کام لے رہا ہے اس لئے اسے نفع میں سے حصہ دینا چاہیئے۔ مگر جو شخص بیماری میں علاج پر صرف کرنے کے لئے، یا کسی میت کی تجہیز و تکفین کے لئے روپیہ قرض لے رہا ہے اُس کے پاس یہ سرمایہ آخر کونسی معاشی قدر پیدا کرتا ہے جس میں حصہ بٹانے کا حق دائن کو پہنچتا ہو؟

پھر جو سرمایہ نفع آور کاموں میں لگایا جاتا ہے وہ بھی لازماً زیادہ قیمت ہی پیدا نہیں کرتا کہ یہ دعوے کیا جا سکے کہ نفع بخشی اسکی ذاتی صفت ہے۔ بسا اوقات کسی کام میں زیادہ سرمایہ لگا دینے سے نفع بڑھنے کے بجائے گھٹ جاتا ہے، یہاں تک کہ الٹے نقصان کی نوبت آجاتی ہے۔ آج کل تجارتی دنیا پر تھوڑی تھوڑی مدت بعد جو بحرانی دورے پڑتے رہتے ہیں اُن کی وجہ یہی تو ہے کہ جب سرمایہ دار کاروبار میں بے تحاشا سرمایہ لگاتے چلے جاتے ہیں اور پیداوار بڑھنی شروع ہوتی ہے تو قیمتیں گرنے لگتی ہیں اور افزونیِ مال کے ساتھ ارزانیِ قدر

رفتہ رفتہ اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ سرمایہ لگانے سے کسی نفع کی توقع باقی نہیں رہتی۔

مزید برآں سرمایہ میں نفع آوری کی اگر کوئی صفت ہے بھی تو اس کا قوت سے فعل میں آنا بہت سی دوسری چیزوں پر منحصر ہے۔ مثلاً اس کے استعمال کرنے والوں کی محنت، قابلیت، ذہانت اور تجربہ کاری۔ دورانِ استعمال میں معاشی، تمدنی اور سیاسی حالات کی سازگاری۔ آفاتِ زمانہ سے محفوظیت۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے امور نفع بخشی کے لازمی شرائط ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو بسا اوقات سرمایہ کی ساری نفع بخشی ختم ہو جاتی ہے، بلکہ الٹی نقصان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مگر سودی کاروبار میں سرمایہ دینے والا نہ تو خود ان شرطوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے، اور نہ یہی مانتا ہے کہ اگر ان میں سے کسی شرط کے مفقود ہو جانے سے اس کا سرمایہ نفع آور نہ ہو سکا تو وہ کوئی سود لینے کا حق دار نہ ہوگا۔ وہ تو اس بات کا مدعی ہے کہ اس کے سرمایہ کا استعمال بجائے خود سود کا استحقاق پیدا کرتا ہے خواہ فی الواقع کوئی "نفع آوری" اس سے ظہور میں آئی ہو یا نہ آئی ہو۔

بدرجہ آخر اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سرمایہ کی ذات ہی میں نفع بخشی موجود ہے جس کی بنا پر سرمایہ دینے والا نفع میں سے حصہ پانے کا مستحق ہے، تب بھی آخر وہ کونسا حساب ہے جس سے تعین کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ آج کل سرمایہ کی نفع بخشی لازماً اس قدر ہے لہٰذا جو لوگ سرمایہ لے کر استعمال کریں اُن کو لازماً اس شرح سے سود ادا کرنا چاہیے؟ اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ زمانہ حال کے لئے اس شرح کا تعین کسی حساب سے ممکن ہے تو ہم یہ سمجھنے سے تو بالکل ہی قاصر ہیں کہ جو سرمایہ دار ۱۹۴۹ء میں کسی کاروباری ادارے کو ۱۰ سال کے لئے، اور کسی دوسرے ادارے کو ۲۰ سال کے لئے رائج الوقت شرحِ سود پر قرض دے رہا ہے اس کے پاس یہ معلوم کرنے کا آخر کیا ذریعہ ہے کہ آئندہ دس اور بیس سال کے دوران میں سرمایہ کی نفع بخشی ضرور آج ہی کے معیار پر قائم رہے گی؟ خصوصاً جب کہ ۱۹۵۹ء میں بازار کی شرحِ سود ۱۹۴۹ء سے بالکل مختلف ہو اور ۱۹۶۹ء میں اس سے بھی زیادہ مختلف ہو جائے تب کس دلیل سے اُس شخص کو حق بجانب ٹھہرایا جائے گا جس نے ایک ادارے سے دس سال کے لئے اور دوسرے ادارے سے بیس سال کے لئے ۱۹۴۹ء کی شرح کے مطابق سرمایہ کے متوقع منافع میں سے اپنا حصہ قطعی طور پر متعین کرا لیا تھا؟

توجیہ چہارم | آخری توجیہ میں ذرا زیادہ ذہانت صرف کی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

انسان فطرۃً حاضر فائدے، لطف، لذت اور آسودگی کو دور دراز مستقبل کے فوائد ولذائذ پر ترجیح دیتا ہے:
مستقبل جتنا دور ہو اسی قدر اس کے فوائد ولذائذ مشتبہ ہوتے ہیں اور اسی مناسبت سے آدمی کی نگاہ میں
ان کی قیمت کم ہوتی جاتی ہے۔ اِس ترجیحِ عاجلہ اور مرجوحیتِ آجلہ کے متعدد وجوہ ہیں، مثلاً:-

۱۔ مستقبل کا تاریکی میں ہونا اور زندگی کا غیر یقینی ہونا جس کی وجہ سے مستقبل کے فوائد مشتبہ بھی ہوتے ہیں
اور اُن کی کوئی واضح تصویر بھی آدمی کی چشم تصور میں نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے آج جو نقد فائدہ حاصل ہو رہا
ہے وہ یقینی بھی ہے اور اسکو آدمی بچشم سر بھی دیکھ رہا ہے۔

۲۔ جو شخص اِس وقت حاجت مند ہے اُسکی حاجت کا اِس وقت پورا ہو جانا اُس کے لئے اِس سے بہت
زیادہ قیمت رکھتا ہے کہ آئندہ کسی موقع پر اُسکو وہ چیز ملے جس کا ممکن ہے کہ وہ اُس وقت حاجت مند ہو اور
ممکن ہے کہ نہ ہو۔

۳۔ جو مال اس وقت مل رہا ہے وہ بالفعل کارآمد اور قابلِ استعمال ہے، اس لحاظ سے وہ اُس مال پر فوقیت
رکھتا ہے جو آئندہ کسی وقت حاصل ہوگا۔

اِن وجوہ سے حاضر کا نقد فائدہ مستقبل کے مشتبہ فائدے پر ترجیح رکھتا ہے۔ لہٰذا آج جو شخص ایک
رقم قرض لے رہا ہے اسکی قیمت لازماً اُس رقم سے زیادہ ہے جو وہ کل دائن کو ادا کرے گا، اور سود وہ
قدرِ زائد ہے جو ادائیگی کے وقت اصل کے ساتھ شامل ہو کر اسکی قیمت کو اُس رقم کے برابر کرتی ہے جو
قرض دیتے وقت دائن نے اسکو دی تھی۔ مثال کے طور پر اس معاملہ کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص ساہوکار کے
پاس آتا ہے اور اس سے سو روپے قرض مانگتا ہے۔ ساہوکار اس سے یہ بات طے کرتا ہے کہ آج جو سو روپے
وہ اسکو دے رہا ہے ان کے بدلے میں وہ ایک سال بعد اس سے ۱۰۳ روپے لیگا۔ اس معاملہ میں دراصل حاضر
کے ۱۰۰ روپوں کا تبادلہ مستقبل کے ۱۰۳ روپوں سے ہو رہا ہے۔ تین روپے اُس فرق کے برابر ہیں جو حاضر کے
مال اور مستقبل کے مال کی نفسیاتی (نہ کہ معاشی) قیمت کے درمیان پایا جاتا ہے۔ جب تک یہ تین روپے
ایک سال بعد کے سو روپوں کے ساتھ شامل نہ ہوں گے ان کی قیمت اُن سو روپوں کے برابر نہ ہوگی جو قرض
دیتے وقت دائن نے مدیون کو دیئے تھے۔

یہ توجیہ جس ہوشیاری کے ساتھ کی گئی ہے اسکی داد نہ دینا ظلم ہے۔ مگر درحقیقت اس میں حاضر اور مستقبل کی نفسیاتی قیمت کا جو فرق بیان کیا گیا ہے وہ ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

کیا فی الواقع انسانی فطرت حاضر کو مستقبل کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور زیادہ قیمتی سمجھتی ہے؟ اگر یہ بات ہے تو کیا وجہ ہے کہ بیشتر لوگ اپنی ساری کمائی کو آج ہی خرچ کر ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ اس کے ایک حصے کو مستقبل کے لئے بچا رکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں؟ شاید آپ کو ایک فی صدی بھی ایسے آدمی نہ ملیں گے جو فکر فردا سے بے نیاز ہوں اور آج کے لطف و لذت پر اپنا سارا مال اڑا دینے کو ترجیح دیتے ہوں۔ کم از کم ۹۹ فی صدی انسانوں کا حال تو یہی ہے کہ وہ آج کی ضرورتوں کو روک کر کل کے لئے کچھ نہ کچھ سامان کر رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ مستقبل میں پیش آنے والی بہت سی متوقع اور ممکن ضرورتیں اور اندیشناک صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا خیالی نقشہ آدمی کی نگاہ میں اُن حالات کی بہ نسبت زیادہ بڑا اور اہم ہوتا ہے جن سے وہ اِس وقت کسی نہ کسی طرح لشتم پشتم گزرے جا رہا ہے۔ پھر وہ ساری دوڑ دھوپ اور تگ و دو جو ایک انسان زمانۂ حال میں کرتا ہے اُس سے مقصود آخر اس کے سوا کیا ہوتا ہے کہ اس کا مستقبل بہتر ہو؟ اپنی آج کی محنتوں کے سارے ثمرات آدمی اسی کوشش میں تو کھپاتا ہے کہ اس کے آنے والے ایام زندگی آج سے زیادہ اچھی طرح بسر ہوں۔ کوئی احمق سے احمق آدمی بھی بمشکل آپ کو ایسا مل سکیگا جو اِس قیمت پر اپنے حاضر کو خوش آیند بنانا پسند کرتا ہو کہ اس کا مستقبل خراب ہو جائے یا کم از کم آج سے زیادہ بدتر ہو۔ جہالت و نادانی کی بنا پر آدمی ایسا کر جائے، یا کسی وقتی خواہش کے طوفان سے مغلوب ہو کر ایسا کر گذرے تو بات دوسری ہے، ورنہ سوچ سمجھ کر تو کوئی شخص بھی اس رویئے کو صحیح و معقول قرار نہیں دیتا۔

پھر اگر تھوڑی دیر کے لئے اس دعوے کو جوں کا توں مان بھی لیا جائے کہ انسان حاضر کے اطمینان کی خاطر مستقبل کے نقصان کو گوارا کرنا درست سمجھتا ہے، تب بھی وہ استدلال ٹھیک نہیں بیٹھتا جس کی بنا اس دعوے پر رکھی گئی ہے۔ قرض لیتے وقت جو معاملہ دائن اور مدیون کے درمیان طے ہوا تھا اُس میں تو آپ کے قول کے مطابق حاضر کے ۱۰۰ روپوں کی قیمت ایک سال بعد کے ۱۰۳ روپوں کے برابر تھی۔ لیکن اب جو ایک سال کے بعد مدیون اپنا قرض ادا کرنے گیا تو واقعی صورتِ معاملہ کیا ٹھہری؟ یہ کہ حاضر کے ۱۰۳ روپے ماضی کے سو روپوں

کے برابر ہو گئے۔ اور اگر پہلے سال مدیون قرض ادا نہ کر سکا تو دوسرے سال کے خاتمے پر ماضی بعید کے سو روپوں کی قیمت حاضر کے ۶۰ ۱ روپوں کے برابر ہو گئی۔ کیا فی الواقع ماضی اور حال میں قدر و قیمت کا یہی تناسب ہے؟ اور کیا یہ اصول بھی صحیح ہے کہ جتنا جتنا ماضی پرانا ہوتا جائے اس کی قیمت بھی حال کے مقابلے میں بڑھتی چلی جائے؟ کیا پہلے گزری ہوئی ضرورتوں کی آسودگی آپ کے لئے اتنی ہی قابلِ قدر ہے کہ جو روپے آپ کو ایک مدتِ دراز پہلے ملے تھے اور جن کو خرچ کر کے آپ کبھی کا نسیاً منسیا کر چکے ہیں، وہ آپ کے لئے زمانے کی ہر ساعت گزرنے پر حاضر کے روپوں سے زیادہ قیمتی ہوتے چلے جائیں، یہاں تک کہ اگر آپ کو سو روپے استعمال کئے ہوئے پچاس برس گزر چکے ہوں تو اب ان کی قیمت ڈھائی سو روپے کے برابر ہو جائے؟

شرحِ سود کی معقولیت؟ یہ ہے اُن دلائل کی کل کائنات جو سود خواری کے وکیل اس کو عقل و انصاف کی رو سے ایک جائز و مناسب چیز ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں۔ تنقید سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ معقولیت سے اس ناپاک چیز کو دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ کسی وزنی دلیل سے بھی اس بات کی کوئی معقول وجہ پیش نہیں کی جا سکتی کہ سود کیوں لیا اور دیا جائے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو چیز اس قدر غیر معقول تھی، مغرب کے علما اور مفکرین نے اس کو بالکل بدیہیات و مسلمات میں شامل کر لیا، اور نفسِ سود کی معقولیت کو گویا ایک طے شدہ صداقت اور مانی ہوئی حقیقت فرض کر کے ساری گفتگو اس امر پر مرکوز کر دی کہ شرحِ سود "معقول" ہونی چاہیئے۔ دورِ جدید کے مغربی لٹریچر میں یہ بحث تو آپ کو کم ہی کہیں ملے گی کہ سود بجائے خود لینے اور دینے کے لائق چیز بھی ہے یا نہیں، البتہ جو کچھ بھی رد و قدح آپ ان کے ہاں دیکھیں گے وہ زیادہ تر اس امر سے متعلق ہو گی کہ فلاں شرحِ سود "بیجا" اور حد سے بڑھی ہوئی ہے اس لئے قابلِ اعتراض ہے، اور فلاں شرح "معقول" ہے اس لئے قابلِ قبول ہے۔

مگر کیا فی الواقع کوئی شرحِ سود معقول بھی ہے؟ تھوڑی دیر کے لئے ہم اس سوال کو نظر انداز کئے دیتے ہیں کہ جس چیز کا بجائے خود معقول ہونا ثابت نہیں کیا جا سکتا اُس کی شرح کے معقول یا نامعقول ہونے کی بحث پیدا ہی کہاں ہوتی ہے۔ اس سوال سے قطعِ نظر کر کے ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کونسی شرحِ سود ہے جس کو فطری اور معقول کہا جاتا ہے؟ اور ایک شرح کے بجا یا بیجا ہونے کا آخر معیار کیا ہے؟ اور کیا درحقیقت دنیا کے سودی کاروبار میں شرحِ سود کا تعین کسی عقلی (Rational) بنیاد پر ہو رہا ہے؟

اس سوال کی جب ہم تحقیق کرتے ہیں تو اوّلین حقیقت جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ "معقول شرحِ سود" نامی کوئی چیز دنیا میں کبھی نہیں پائی گئی ہے۔ مختلف شرحوں کو مختلف زمانوں میں معقول ٹھیرایا گیا ہے اور بعد میں وہی شرحیں نامعقول قرار دے دی گئی ہیں۔ بلکہ ایک ہی زمانہ میں ایک جگہ معقول شرح کچھ ہے اور دوسری جگہ کچھ اور۔ قدیم ہندو دور میں کوتیلہ (Kautilya) کی تصریح کے مطابق ۱۵ سے ۶۰ فی صدی سالانہ تک شرحِ سود بالکل معقول اور جائز سمجھی جاتی تھی، اور اگر خطرہ زیادہ ہو تو اس سے بھی زیادہ شرح ہو سکتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے وسطِ آخر اور انیسویں صدی کے وسطِ اوّل میں ہندوستانی ریاستوں کے جو مالی معاملات ایک طرف دیسی ساہوکاروں سے اور دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے ہوتے تھے اُن میں بالعموم ۴۰ فی صدی سالانہ شرح رائج تھی۔ سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگِ عظیم کے زمانے میں حکومتِ ہند نے ۶½ فی صدی سالانہ سود پر جنگی قرضے حاصل کیے۔ سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۳۰ء کے درمیان کوآپریٹو سوسائٹیوں میں عام شرحِ سود ۱۲ سے ۱۵ فی صدی تک رہی۔ سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۴۰ء کے دور میں ملک کی عدالتیں ۹ فی صدی سالانہ کے قریب شرح کو معقول قرار دیتی رہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے لگ بھگ زمانے میں ریزرو بینک آف انڈیا کا ڈسکونٹ ریٹ ۳ فی صدی سالانہ مقرر ہوا اور یہی شرح دورانِ جنگ میں بھی قائم رہی بلکہ پونے تین فی صدی پر بھی حکومتِ ہند کو قرضے ملتے رہے۔ یہ تو ہے خود ہمارے اپنے برِعظیم کا حال۔ اُدھر یورپ کو دیکھیے تو وہاں بھی آپ کو کچھ ایسا ہی نقشہ نظر آئے گا۔ سولھویں صدی کے وسط میں انگلستان میں ۱۰ فی صدی شرح بالکل معقول قرار دی گئی تھی۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے قریب زمانے میں یورپ کے بعض سنٹرل بینک آٹھ نو فی صدی شرح لگاتے تھے اور خود مجلس اقوام نے یورپ کی ریاستوں کو اپنی وساطت سے جو قرضے اُس دور میں دلوائے تھے ان کی شرح بھی اسی کے لگ بھگ تھی۔ مگر آج یورپ اور امریکہ میں کسی کے سامنے اس شرح کا نام لیجیے تو وہ چیخ اُٹھے گا کہ یہ شرحِ سود نہیں بلکہ لوٹ ہے۔ اب جدھر دیکھیے ۲½ اور ۳ فی صدی شرح کا چرچا ہے۔ ۴ فی صدی انتہائی شرح ہے، اور بعض حالات میں ایک اور ½ اور ¾ فی صدی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف غریب عوام کو سودی قرض دینے والے مہاجنوں کے لیے انگلستان میں سنہ ۱۹۲۷ء کے منی لینڈرس ایکٹ کی رو سے جو شرح جائز رکھی گئی ہے وہ ۴۸ فی صدی سالانہ ہے اور امریکہ کی عدالتیں سُود خوار مہاجنوں کو جس شرح کے مطابق سود دلوا رہی ہیں وہ ۳۰ سے شروع ہو کر ۲۶۰ فی صدی سالانہ تک پہنچ جاتی ہے۔

بتایئے ان میں سے کس کا نام فطری اور معقول شرح سود ہے ؟

اب ذرا آگے بڑھ کر اس مسئلے کا جائزہ لیجیے کہ کیا فی الحقیقت کوئی شرحِ سود فطری اور معقول ہو بھی سکتی ہے ؟ اس سوال پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کی عقل خود بتا دے گی کہ شرحِ سود اگر معقول طور پر متعین ہو سکتی تھی تو صرف اس صورت میں جب کہ اُس فائدے کی قیمت مشخص ہوتی رہا ہو سکتی، جو ایک شخص کسی قرض لی ہوئی رقم سے اٹھاتا ہے۔ مثلاً اگر یہ بات متعین ہو جاتی کہ ایک سال تک سو روپے کا استعمال ۲۵ روپے کے برابر فائدہ دیتا ہے تو البتہ یہ طے کیا جا سکتا تھا کہ اس فائدے میں سے ۵ یا ۲½ یا ۱¼ روپیہ اُس شخص کا فطری اور معقول حصہ ہے جس کی رقم دورانِ سال میں استعمال کی گئی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس طرح سے استعمالِ سرمایہ کا فائدہ نہ تو مشخص کیا گیا ہے، نہ کیا جا سکتا ہے، اور نہ بازاری شرحِ سود کے تعیّن میں کبھی اس امر کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ روپیہ قرض لینے والے کو اس سے کتنا فائدہ ہوگا، بلکہ کوئی فائدہ ہوگا بھی یا نہیں۔ عملاً جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مہاجنی کاروبار میں تو قرض کی قیمت قرض مانگنے والے کی مجبوری کے لحاظ سے مشخص ہوتی ہے، اور تجارتی سودخواری کی منڈی میں شرحِ سود کا اتار چڑھاؤ کچھ دوسری بنیادوں پر ہوتا رہتا ہے جن کو عقل اور انصاف سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

شرحِ سود کے وجوہ پہلی قسم کے کاروبار میں ایک مہاجن یہ دیکھتا ہے کہ جو شخص اس سے قرض مانگنے آیا ہے وہ کس حد تک غریب ہے، کتنا مجبور ہے اور قرض نہ ملنے کی صورت میں کس قدر زیادہ مبتلائے آفت ہوگا۔ انہی چیزوں کے لحاظ سے وہ طے کرتا ہے کہ مجھے اس سے کتنا سود مانگنا چاہیے۔ اگر وہ کم غریب ہے، کم رقم مانگ رہا ہے اور بہت زیادہ پریشان نہیں ہے تو شرحِ سود کم ہوگی۔ اس کے برعکس وہ جتنا زیادہ خستہ حال اور جس قدر زیادہ سخت حاجتمند ہوگا اتنی ہی شرح بڑھتی چلی جائیگی، حتیٰ کہ اگر کسی فاقہ کش آدمی کا بچہ بیماری کی حالت میں دم توڑ رہا ہو تو چار پانچ سو فی صدی شرحِ سود بھی اس کے معاملہ میں کچھ "بےجا" نہیں ہے۔ اس طرح کی صورت حال میں "فطری" شرحِ سود قریب قریب اُسی معیار کے لحاظ سے مشخص ہوتی ہے جس معیار کے لحاظ سے ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ قیامت میں امرتسر کے اسٹیشن پر ایک سکھ نے ایک مسلمان سے پانی کے ایک گلاس کی "فطری" قیمت ۲۰۰ روپے وصول کی تھی، کیونکہ اس کا بچہ پیاس سے مر رہا تھا اور پناہ گزینوں کی ٹرین سے کوئی مسلمان نیچے اتر کر خود پانی نہیں لے سکتا تھا !

رہا دوسری قسم کا بازارِ مالیات، تو اس میں شرح سود کا تعین اور اس کا اتار چڑھاؤ جن بنیادوں پر ہوتا ہے ان کے بارے میں ماہرینِ معاشیات کے دو مسلک ہیں:

(۱) ایک گروہ کہتا ہے کہ طلب اور رسد کا قانون اس کی بنیاد ہے۔ جب روپیہ لگانے کے خواہشمند کم ہوتے ہیں اور قرض دینے کے قابل رقمیں زیادہ ہو جاتی ہیں تو سود کی شرح گرنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بہت زیادہ گر جاتی ہے تو لوگ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر کاروبار میں لگانے کیلئے روپیہ قرض لینے پر بکثرت آمادہ ہونے لگتے ہیں۔ پھر جب روپے کی مانگ بڑھنی شروع ہوتی ہے اور قابل قرض رقمیں کم ہونے لگتی ہیں تو شرح سود بڑھنی شروع ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ قرض کی مانگ رک جاتی ہے۔

غور کیجئے، اس کے معنی کیا ہیں۔ سرمایہ دار یہ نہیں کرتا کہ سیدھے اور معقول طریقہ سے کاروباری آدمی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کرے اور انصاف کے ساتھ اُس کے واقعی منافع میں اپنا حصہ لگائے۔ اس کے بجائے وہ ایک اندازہ کرتا ہے کہ کاروبار میں اِس شخص کو کم از کم اتنا فائدہ ہو گا لہٰذا جو رقم میں اسے دے رہا ہوں اس پر مجھے اتنا سود ملنا چاہیئے۔ دوسری طرف کاروباری آدمی بھی اندازہ کرتا ہے کہ جو روپیہ میں اس سے لیکر لگا رہا ہوں وہ مجھے زیادہ سے زیادہ اتنا نفع دے سکتا ہے لہٰذا سود اس سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے۔ دونوں قیاس (Speculation) سے کام لیتے ہیں۔ سرمایہ دار ہمیشہ کاروبار کے منافع کا مبالغہ آمیز تخمینہ کرتا ہے۔ اور کاروباری آدمی نفع کی امیدوں کے ساتھ نقصان کے اندیشوں کو بھی سامنے رکھتا ہے۔ اس بنا پر دونوں کے درمیان تعاون کے بجائے ایک دائمی کشمکش برپا رہتی ہے۔ جب کاروباری آدمی نفع کی امید پر سرمایہ لگانا چاہتا ہے تو سرمایہ دار اپنے سرمایہ کی قیمت بڑھانی شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ اتنی بڑھ جاتا ہے کہ اس قدر شرح سود پر روپیہ لے کر کام میں لگانا کسی طرح نفع بخش نہیں رہتا۔ اس طرح آخر کار روپے کا کام میں لگنا بند ہو جاتا ہے اور معاشی ترقی کی رفتار یکایک رک جاتی ہے۔ پھر جب کساد بازاری کا سخت دورہ پوری کاروباری دنیا پر پڑ جاتا ہے اور سرمایہ دار دیکھتا ہے کہ اس کی اپنی تباہی قریب آ لگی ہے تو وہ شرح سود کو اس حد تک گرا دیتا ہے کہ کاروباری آدمیوں کو اس شرح پر روپیہ لیکر لگانے میں نفع کی امید ہو جاتی ہے اور صنعت و تجارت کے بازار میں پھر سرمایہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر معقول شرائط پر سرمایہ اور کاروبار کے درمیان حصہ دارانہ تعاون ہوتا تو ایک ہموار طریقے سے دنیا کی معیشت کا نظام

چل سکتا تھا لیکن جب قانون نے سرمایہ دار کے لئے سود پر روپیہ چلانے کا راستہ کھول دیا تو سرمایے اور کاروبار کے باہمی تعلقات میں سٹہ بازی اور جواری پن کی روح داخل ہوگئی اور شرح سود کی کمی وبیشی ایسے قمار بازانہ طریقوں پر ہونے لگی جن کی بدولت پوری دنیا کی معاشی زندگی ایک دائمی بحران میں مبتلا رہتی ہے۔

(۲) دوسرا گروہ شرح سود کی توجیہ اس طرح کرتا ہے کہ جب سرمایہ دار روپے کو خود اپنے لئے قابل استعمال رکھنا زیادہ پسند کرتا ہے تو وہ سود کی شرح بڑھا دیتا ہے، اور جب اسکی یہ خواہش کم ہوجاتی ہے تو سود کی شرح بھی گھٹ جاتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ سرمایہ دار نقد روپیہ اپنے پاس رکھنے کو کیوں ترجیح دیتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ یہ دیتے ہیں کہ اس کے متعدد وجوہ ہیں۔ کچھ نہ کچھ روپیہ اپنی ذاتی یا کاروباری ضرورتوں کیلئے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اور کچھ نہ کچھ ناگہانی حالات اور غیر متوقع ضروریات کے لئے بھی محفوظ رکھنا پڑتا ہے، مثلاً کسی ذاتی معاملہ میں کوئی غیر معمولی خرچ یا کسی اچھے سودے کا موقع یکایک سامنے آجانا۔ ان دو وجوہ کے علاوہ تیسری وجہ، اور زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار یہ پسند کرتا ہے کہ مستقبل میں کسی وقت قیمتیں گرنے یا شرح سود چڑھنے کی صورت میں فائدہ اٹھانے کے لئے اس کے پاس نقد روپیہ کافی موجود ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان وجوہ کی بنا پر روپے کو اپنے لئے قابل استعمال رکھنے کی جو خواہش سرمایہ دار کے دل میں پیدا ہوتی ہے، کیا وہ گھٹتی بڑھتی ہے کہ اس کا اثر شرح سود کے اتار چڑھاؤ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے؟ اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ ہاں مختلف شخصی، اجتماعی، سیاسی اور معاشی اسباب سے کبھی یہ خواہش بڑھ جاتی ہے اسلئے سرمایہ دار شرح سود بڑھا دیتا ہے اور کاروبار کی طرف سرمایہ آنا کم ہوجاتا ہے۔ اور کبھی اس خواہش میں کمی آجاتی ہے اسلئے سرمایہ دار شرح سود گھٹا دیتا ہے اور اس کے گھٹنے کی وجہ سے لوگ تجارت وصنعت میں لگانے کیلئے زیادہ سرمایہ قرض لینے لگتے ہیں۔

اس خوشنما توجیہ کے پیچھے ذرا جھانک کر دیکھئے کہ کیا چیز چھپی ہوئی ہے۔ جہاں تک خانگی ضروریات یا ذاتی کاروبار کی ضروریات کا تعلق ہے ان کی بنا پر معمولی اور غیر معمولی سب طرح کے حالات میں سرمایہ دار کی یہ خواہش کہ وہ سرمایہ کو اپنے لئے قابل استعمال رکھے بمشکل اسکے پانچ فیصدی سرمایے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسلئے پہلی دونوں وجہوں کو خواہ مخواہ اہمیت دینا صحیح نہیں ہے۔ اب رہا ۹۵ فیصدی سرمایہ جس کو بنیا درپردہ کبھی روکتا ہے اور کبھی بازار زر کی طرف بہاتا ہے، وہ تو تیسری وجہ ہے اور اس کا تجزیہ کیجئے تو اس کے اندر سے اصل حقیقت یہ برآمد ہوگی کہ شرح

کمال درجہ کی خود غرضانہ ذہنیت کے ساتھ دنیا کے اور خود اپنے ملک و قوم کے حالات کو دیکھتا رہتا ہے۔ ان حالات میں کبھی وہ کچھ مخصوص آثار دیکھتا ہے اور انکی بنا پر چاہتا ہے کہ اس کے پاس وہ ہتھیار ہر وقت موجود رہے جس کے ذریعہ سے وہ سوسائٹی کی مشکلات آفات اور مصائب کا ناجائز فائدہ اٹھا سکے اور اسکی پریشانیوں میں اضافہ کر کے اپنی خوشحالی بڑھا سکے۔ اسلئے وہ سٹہ بازی کی خاطر سرمایہ کو اپنے لئے روک لیتا ہے، شرح سُود بڑھا دیتا ہے، تجارت و صنعت کی طرف سرمائے کا بہاؤ یکلخت بند کر دیتا ہے اور سوسائٹی پر اس بلائے عظیم کا دروازہ کھول دیتا ہے جس کا نام "کساد بازاری" ہے پھر جب وہ دیکھتا ہے کہ اس راستہ سے جو کچھ حرام خوری وہ کر سکتا تھا کر چکا، آگے مزید فائدے کا کوئی امکان باقی نہیں ہے، بلکہ نقصان کی سرحد قریب آ لگی ہے تو سرمائے کو اپنے لئے قابل استعمال رکھنے کی خواہش اُس کے نفسِ خبیث میں کم ہو جاتی ہے اور وہ کم شرحِ سُود کا لالچ دے کر کاروباری لوگوں کو صلائے عام دینے لگتا ہے کہ آؤ میرے پاس بہت سا روپیہ تمہارے لئے قابل استعمال پڑا ہے۔

شرحِ سود کی بس یہی دو توجیہات موجودہ زمانے کے ماہرین معاشیات نے کی ہیں، اور اپنی اپنی جگہ دونوں ہی صحیح ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان میں سے جو وجہ بھی ہو، اس سے آخر ایک "معقول" اور "فطری" شرح کس طرح متعین ہوتی یا ہو سکتی ہے؟ یا تو ہمیں عقل اور معقولیت اور فطرت کے مفہومات بدلنے پڑیں گے، یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ سود خود جس قدر نامعقول چیز ہے اسکی شرح بھی اتنے ہی نامعقول اسباب سے متعین ہوتی اور گھٹتی بڑھتی ہے۔

سود کا معاشی فائدہ اور اسکی ضرورت؟ اس کے بعد سود کے وکلاء یہ بحث چھیڑ دیتے ہیں کہ سود ایک معاشی ضرورت ہے اور کچھ فوائد ایسے ہیں جو اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس دعوے کی تائید میں جو دلائل وہ دیتے ہیں انکا خلاصہ یہ ہے

(۱) انسانی معیشت کا سارا کاروبار سرمائے کے اجتماع پر منحصر ہے، اور سرمائے کا جمع ہونا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ لوگ اپنی ضروریات اور خواہشات پر پابندی عائد کریں اور اپنی ساری ساری آمدنیوں کو اپنی ذات پر خرچ نہ کر ڈالیں بلکہ کچھ نہ کچھ پس انداز بھی کرتے رہا کریں۔ یہی ایک صورت ہے سرمایہ اکٹھا ہونے کی۔ لیکن آخر ایک آدمی کیوں اپنی ضروریات کو روکنے اور کفایت شعاری کرنے پر آمادہ ہو اگر اسے اِس ضبطِ نفس اور اس قربانی کا کوئی اجر نہ ملے؟ سود ہی تو وہ اجر ہے جس کی امید لوگوں کو روپیہ بچانے پر آمادہ کرتی ہے۔ تم اسے حرام کر دو گے تو سرے سے فاضل آمدنیوں کو محفوظ کرنے کا سلسلہ ہی بند ہو جائے گا جو سرمایہ کی بہم رسانی کا اصل ذریعہ ہے۔

(۲) معاشی کاروبار کی طرف سرمائے کے بہاؤ کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ لوگوں کیلئے اپنی جمع شدہ دولت کو سود پر چلانے کا دروازہ کھلا رہے۔ اس طرح سود ہی کا لالچ ان سے روپیہ جمع کراتا ہے پھر سود ہی کا لالچ ان کو اس بات پر بھی آمادہ کرتا رہتا ہے کہ اپنی پس انداز کی ہوئی رقموں کو بیکار نہ ڈال رکھیں بلکہ کاروباری لوگوں کے حوالہ کردیں اور ایک مقرر شرح کے مطابق سود وصول کرتے رہیں۔ اس دروازے کو بند کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نہ صرف روپیہ جمع کرنے کا ایک اہم ترین محرک غائب ہو جائے، بلکہ جو تھوڑا بہت سرمایہ جمع ہو وہ بھی کاروبار میں لگنے کے لئے حاصل نہ ہو سکے۔

(۳) سود صرف یہی نہیں کرتا کہ سرمایہ جمع کرتا اور اسے کاروبار کی طرف کھینچ کر لاتا ہے، بلکہ وہی اس کے غیر مفید استعمال کو روکتا بھی ہے۔ اور شرح سود وہ چیز ہے جو بہترین طریقہ سے آپ ہی آپ اس امر کا انتظام کرتی رہتی ہے کہ سرمایہ کاروبار کی مختلف ممکن تجویزوں میں سے اُن تجویزوں کی طرف جائے۔ جو اُن میں سب سے زیادہ بارآور ہوں۔ اس کے سوا کوئی تدبیر ایسی سمجھ میں نہیں آتی جو مختلف عملی تجویزوں میں سے نافع کو غیر نافع سے اور زیادہ نافع کو کم نافع سے ممیز کرے اور انفع کی طرف سرمائے کا رخ پھیرتی رہے۔ تم سود کو اڑا دو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اول تو لوگ بڑی بے پروائی سے سرمایہ استعمال کرنے لگیں گے، اور پھر بلالحاظ نفع و نقصان، ہر طرح کے الٹے سیدھے کاموں میں اسے لگانا شروع کر دینگے۔

(۴) قرض وہ چیز ہے جو انسانی زندگی کی ناگزیر ضروریات میں سے ہے۔ افراد کو بھی اپنے ذاتی معاملات میں اس کی ضرورت پیش آتی ہے، کاروباری لوگوں کو بھی آئے دن اسکی حاجت رہتی ہے، اور حکومتوں کا کام بھی اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس کثرت سے اتنے بڑے پیمانے پر قرض کی بہم رسانی آخر نری خیرات کے بل پر کہاں تک ہو سکتی ہے۔ اگر تم صاحب سرمایہ لوگوں کو سود کا لالچ نہ دوگے اور اس امر کا اطمینان بہم نہ پہنچاؤ گے کہ ان کے راس المال کے ساتھ ان کا سود بھی ان کو ملتا رہیگا تو وہ مشکل ہی قرض دینے پر آمادہ ہوں گے اور اس طرح قرضوں کی بہم رسانی رک جانے کا نہایت برا اثر پوری معاشی زندگی پر مترتب ہوگا۔ ایک غریب آدمی کو اپنے برے وقت پر مہاجن سے قرض مل تو جاتا ہے۔ سود کا لالچ نہ ہو تو اُس کا مردہ بے کفن ہی پڑا رہ جائے اور کوئی اسکی طرف مدد کا ہاتھ نہ بڑھائے۔ ایک تاجر کو تنگ موقع پر سودی قرض فوراً مل جاتا ہے اور اس کا کام چلتا رہتا ہے۔ یہ دروازہ بند ہو جائے تو نہ معلوم کتنی مرتبہ اس کا دیوالہ نکلنے کی نوبت آجائے۔ ایسا ہی معاملہ حکومتوں کا بھی ہے کہ ان کی ضرورتیں سودی قرض ہی سے پوری ہوتی رہتی ہیں، ورنہ کروڑوں روپے فراہم کرنے والے سخی داتا آخر انہیں روز روز کہاں مل سکتے ہیں۔

آیئے اب ہم ان میں سے ایک ایک "فائدے" اور "ضرورت" کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ آیا فی الحقیقت وہ کوئی فائدہ اور ضرورت ہے بھی یا یہ سب کچھ محض ایک شیطانی وسوسہ ہے۔

اولین غلط فہمی یہ ہے کہ معاشی زندگی کے لئے افراد کی کفایت شعاری اور زر اندوزی کو ایک ضروری اور مفید چیز سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ درحقیقت ساری معاشی ترقی و خوشحالی منحصر ہے اس پر کہ جماعت بحیثیت مجموعی جتنا کچھ سامان زیست پیدا کرتی جائے وہ جلدی جلدی فروخت ہوتا چلا جائے تاکہ پیداوار اور اسکا صرف دونوں توازن کے ساتھ اور تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہے۔ یہ بات صرف اُسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ لوگ بالعموم اس امر کے عادی ہوں کہ معاشی سعی و عمل کے دوران میں جتنی کچھ دولت ان کے حصہ میں آئے اسے صرف کرتے رہیں اور ایسی قدر فراخ دل ہوں کہ اگر ان کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ دولت آگئی ہو تو اسے جماعت کے کم نصیب افراد کی طرف منتقل کردیا کریں تاکہ وہ بھی بفراغت اپنے لئے ضروریاتِ زندگی خرید سکیں۔ مگر تم اس کے برعکس لوگوں کو یہ سکھاتے ہو کہ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت پہنچ گئی ہو وہ اسے روک رکھے اور جس کے پاس بقدر ضرورت دولت پہنچی ہو وہ بھی کنجوسی برت کر جسے تم ضبط نفس اور زہد اور قربانی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہو اپنی مناسب ضروریات کا ایک اچھا خاصا حصہ پورا کرنے سے باز رہے اور اس طرح ہر شخص زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی کوشش کرے۔ تمہارے نزدیک اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ سرمایہ اکٹھا ہوکر صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے بہم پہنچ سکیگا۔ لیکن درحقیقت اس کا نقصان یہ ہوگا کہ جو مال اس وقت بازار میں موجود ہے اس کا ایک بڑا حصہ یونہی پڑا رہ جائیگا۔ کیونکہ جن لوگوں کے اندر قوتِ خرید پہلے ہی کم تھی وہ تو استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے بہت سا مال نہ خرید سکے اور جو بقدر ضرورت خرید سکتے تھے انہوں نے استطاعت رکھنے کے باوجود پیداوار کا اچھا خاصہ حصہ نہ خریدا اور جن کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ قوتِ خریداری پہنچ گئی تھی انہوں نے بھی اُسے اپنے پاس روک کر رکھ لیا۔ اب اگر ہر معاشی چکر میں یہی ہوتا رہے کہ بقدر ضرورت اور زائد از ضرورت قوتِ خرید پانے والے لوگ اپنی اس قوت کے بڑے حصے کو نہ تو خود پیداوار کے خریدنے میں استعمال کریں نہ کم قوتِ خرید رکھنے والوں کو دیں بلکہ اسے روکتے اور جمع کرتے چلے جائیں تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ ہر چکر میں جماعت کی معاشی پیداوار کا معتد بہ حصہ فروخت سے رکتا چلا جائے گا۔ مال کی کھپت کم ہونے سے روزگار میں کمی واقع

ہوگی۔ روزگار کی کمی آمدنیوں کی کمی پر منتج ہوگی۔ اور آمدنیوں کی کمی سے پھر اموالِ تجارت کی کھپت میں مزید کمی رونما ہوتی چلی جائیگی۔ اس طرح چند افراد کی زراندوزی بہت سے افراد کی بدحالی کا سبب بنے گی اور آخرکار یہ چیز خود ان زراندوز افراد کے لئے بھی وبالِ جان بن جائیگی، کیونکہ جب دولت کو وہ خریداری میں استعمال کرنے کے بجائے سمیٹ سمیٹ کر مزید پیداوار میں استعمال کریں گے آخر اس کے ذریعہ سے تیار کی ہوئی پیداوار کھپے گی کہاں؟

اس حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصل معاشی ضرورت تو اُن اسباب اور محرکات کو دور کرنا ہے جن کی بنا پر افراد اپنی آمدنیوں کو خرچ کرنے کے بجائے روک رکھنے اور جمع کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ساری جماعت کی معاشی فلاح یہ چاہتی ہے کہ ایک طرف اجتماعی طور پر ایسے انتظامات کردیئے جائیں جن کی بدولت ہر شخص کو اپنے برے وقت پر مالی مدد مل جایا کرے تاکہ لوگوں کو اپنی آمدنیاں جمع کرنے کی حاجت ہی نہ محسوس ہو، اور دوسری طرف جمع شدہ دولت پر زکوٰۃ عائد کی جائے تاکہ لوگوں کے اندر جمع کرنے کا میلان کم ہو اور اس کے باوجود جو دولت رک جائے اس کا ایک حصہ بہرحال ان لوگوں تک پہنچتا رہے جنہوں نے گردشِ دولت میں سے کم حصہ پایا ہے۔ لیکن تم اس کے برعکس سود کا لالچ دے دے کر لوگوں کے طبعی بخل کو اور زیادہ اکساتے اور جو بخیل نہیں ہیں ان کو بھی یہ سکھاتے ہو کہ وہ خرچ کرنے کے بجائے مال جمع کریں۔

پھر اس غلط طریقے سے اجتماعی مفاد کے خلاف جو سرمایہ اکٹھا ہوتا ہے اسکو تم پیدائشِ دولت کے کاروبار کی طرف لاتے بھی ہو تو سود کے راستے سے لاتے ہو۔ یہ اجتماعی مفاد پر تمہارا ایک اور ظلم ہے۔ اگر یہ اکٹھی کی ہوئی دولت اس شرط پر کاروبار میں لگتی کہ جتنا کچھ منافع کاروبار میں ہوگا اس میں سے سرمایہ دار کو اس تناسب کے مطابق حصہ مل جائیگا تب بھی چنداں مضائقہ نہ تھا۔ مگر تم اسکو اس شرط پر لگواتے ہو کہ کاروبار میں چاہے منافع ہو یا نہ ہو اور چاہے کم منافع ہو یا زیادہ، بہرحال سرمایہ دار اِس قدر فی صدی منافع ضرور پائے گا۔ اس طرح تم نے اجتماعی معیشت کو دوہرا نقصان پہنچایا۔ ایک نقصان وہ جو روپے کو خرچ نہ کرنے اور روک رکھنے سے پہنچا۔ اور دوسرا یہ کہ جو روپیہ روکا گیا تھا وہ اجتماعی معیشت کی طرف پلٹا بھی تو حصہ داری کے اصول پر کاروبار میں شریک نہیں ہوا بلکہ قرض بن کر پورے معاشرے کی صنعت و تجارت پر لد گیا اور تمہارے قانون نے اسکو یقینی منافع کی ضمانت دے دی۔ اب تمہارے اِس غلط نظام کی وجہ سے صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ معاشرے کے بکثرت افراد اُس قوتِ خریداری کو

جو انہیں حاصل ہوتی ہے، اجتماعی پیداوار کی خریداری میں صرف کرنے کے بجائے روک روک کر ایک سود طلب قرضے کی شکل میں معاشرے کے سر پر لادتے چلے جاتے ہیں۔ اور معاشرہ اس روز افزوں پیچیدگی میں مبتلا ہو گیا ہے کہ آخر وہ اس ہر لحظہ بڑھنے والے قرض و سود کو کس طرح ادا کرے جب کہ اِس سرمائے سے تیار کیے ہوئے مال کی کھپت بازار میں مشکل ہے اور مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ لاکھوں کروڑوں آدمی اسے اس لئے نہیں خریدتے کہ ان کے پاس خریدنے کے لئے پیسہ نہیں۔ اور ہزارہا آدمی اسکو اس لئے نہیں خریدتے کہ وہ اپنی قوت خریداری کو مزید سود طلب قرض بنانے کے لئے روکتے چلے جا رہے ہیں۔

تم اس سود کا یہ فائدہ بتاتے ہو کہ اُس کے دباؤ کی وجہ سے کاروباری آدمی مجبور ہوتا ہے کہ سرمائے کے فضول استعمال سے بچے اور اسکو زیادہ سے زیادہ نفع بخش طریقے سے استعمال کرے۔ تم شرحِ سود کی یہ کرامت بیان کرتے ہو کہ وہ خاموشی کے ساتھ کاروبار کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی رہتی ہے اور یہ اسی کا فیضان ہے کہ سرمایہ اپنے بہاؤ کے لئے تمام ممکن راستوں میں سے اُس کاروبار کے راستے کو چھانٹ لیتا ہے جو سب سے زیادہ نافع ہوتا ہے۔ لیکن ذرا اپنی اس سخن سازی کے پردے کو ہٹا کر دیکھو کہ اس کے نیچے اصل حقیقت کیا چھپی ہوئی ہے۔ دراصل سود نے پہلی خدمت تو یہ انجام دی کہ "فائدے" اور "منفعت" کی تمام دوسری تفسیریں اس کے فیض سے متروک ہو گئیں اور اِن الفاظ کا صرف ایک ہی مفہوم باقی رہ گیا، "یعنی مالی فائدہ" اور "مادی منفعت"۔ اس طرح سرمائے کو بڑی یکسوئی حاصل ہو گئی۔ پہلے وہ اُن راستوں کی طرف بھی چلا جایا کرتا تھا جن میں مالی فائدے کے سوا کسی اور قسم کا فائدہ ہوتا تھا۔ مگر اب وہ سیدھا اُن راستوں کا رُخ کرتا ہے جدھر مالی فائدے کا یقین ہوتا ہے۔ پھر دوسری خدمت وہ اپنی شرحِ خاص کے ذریعہ سے یہ انجام دیتا ہے کہ سرمائے کے مفید استعمال کا معیار سوسائٹی کا فائدہ نہیں بلکہ صرف سرمایہ دار کا فائدہ بن جاتا ہے۔ شرحِ سود یہ طے کر دیتی ہے کہ سرمایہ اُس کام میں صرف ہوگا جو مثلاً ۶ فی صدی سالانہ یا اس سے زیادہ منافع دے سکتا ہو۔ اس سے کم نفع دینے والا کوئی کام اس قابل نہیں ہے کہ اس پر مال صرف کیا جائے۔ اب فرض کیجئے کہ ایک اسکیم سرمایہ کے سامنے یہ آتی ہے کہ ایسے مکانات تعمیر کئے جائیں جو آرام دہ بھی ہوں اور جنہیں غریب لوگ کم کرایہ پر لے سکیں۔ اور دوسری اسکیم یہ آتی ہے کہ ایک شاندار سنیما تعمیر کیا جائے۔ پہلی اسکیم ۴ فی صدی سے کم منافع کی امید دلاتی ہے اور دوسری اسکیم اس سے زیادہ نفع دیتی نظر آتی ہے۔

دوسرے حالات میں تو اس کا امکان تھا کہ سرمایہ "نادانی" کے ساتھ پہلی اسکیم کی طرف بہ جاتا، یا کم از کم ان دونوں کے درمیان متردد ہو کر استخارہ کرنے کی ضرورت محسوس کرتا۔ مگر یہ شرحِ سود کا فیضِ ہدایت ہے کہ وہ سرمایہ کو بلا تامل دوسری اسکیم کا راستہ دکھا دیتا ہے اور پہلی اسکیم کو اس طرح پیچھے پھینکتا ہے کہ سرمایہ اسکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس پر مزید کرامت شرحِ سود میں یہ ہے کہ وہ کاروباری آدمی کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے ہاتھ پاؤں مار کر اپنے منافع کو اُس حد سے اوپر ہی اوپر رکھنے کی کوشش کرے جو سرمایہ دار نے کھینچ دی ہے، خواہ اس غرض کے لئے اسکو کیسے ہی غیر اخلاقی طریقے اختیار کرنے پڑیں۔ مثلاً اگر کسی شخص نے ایک فلم کمپنی قائم کی ہے اور جو سرمایہ اس میں لگا ہوا ہے اسکی شرحِ سود ۶ فی صدی سالانہ ہے تو اسکو لامحالہ وہ طریقے اختیار کرنے پڑیں گے جن سے اس کے کاروبار کا منافع ہر حال میں اس شرح سے زیادہ رہے۔ یہ بات اگر ایسے فلم تیار کرنے سے حاصل نہ ہو سکے جو اخلاقی حیثیت سے پاکیزہ اور علمی حیثیت سے مفید ہوں، تو وہ مجبور ہوگا کہ عریاں اور فحش کھیل تیار کرے اور ایسے ایسے طریقوں سے ان کا اشتہار دے جن سے عوام کے جذبات بھڑکیں اور وہ شہوانیت کے طوفان میں بہ کر اُس کے کھیل دیکھنے کے لئے جوق در جوق امنڈ آئیں۔

یہ ہے اُن فوائد کی حقیقت جو تمہارے نزدیک سود سے حاصل ہوتے ہیں اور جن کے حصول کا کوئی ذریعہ سود کے سوا نہیں ہے۔ اب ذرا اُس ضرورت کا جائزہ بھی لے لیجئے جو آپ کے نزدیک سود کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ قرض انسانی زندگی کی ضروریات میں سے ہے۔ اسکی ضرورت افراد کو اپنی شخصی حاجات میں بھی پیش آتی ہے، صنعت اور تجارت اور زراعت وغیرہ معاشی کاموں میں بھی ہر وقت اسکی مانگ رہتی ہے اور حکومت سمیت تمام اجتماعی ادارے بھی اس کے حاجتمند رہتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سود کے بغیر قرض کی بہم رسانی غیر ممکن ہے۔ دراصل یہ صورتِ حال کہ افراد سے لے کر قوم تک کسی کو بھی ایک پیسہ بلا سود قرض نہیں ملتا، اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ آپ نے سود کو قانوناً جائز کر رکھا ہے۔ اس کو حرام کیجئے اور معیشت کے ساتھ اخلاق کا بھی وہ نظام اختیار کیجئے جو اسلام نے تجویز کیا ہے، پھر آپ دیکھیں گے کہ شخصی حاجات، اور کاروبار، اور اجتماعی ضروریات، ہر چیز کے

لئے قرض بلاسود ملنا شروع ہو جائے گا، بلکہ عطیئے تک ملنے لگیں گے۔ اسلام عملاً اس کا ثبوت دے چکا ہے۔ صدیوں مسلمان سوسائٹی سود کے بغیر بہترین طریقہ پر اپنی معیشت کا سارا کام چلاتی رہی ہے۔ آپ کے اس منحوس دورِ سود خواری سے پہلے کبھی مسلمان سوسائٹی کا یہ حال نہیں رہا ہے کہ کسی مسلمان کا جنازہ اس لئے بے کفن پڑا رہ گیا ہو کہ اس کے وارث کو کہیں سے بلاسود قرض نہیں ملا، یا مسلمانوں کی صنعت و تجارت اور زراعت اس لئے بیٹھ گئی ہو کہ کاروباری ضروریات کے مطابق قرضِ حَسَن بہم پہنچنا غیر ممکن ثابت ہوا، یا مسلمان حکومتیں رفاہ عام کے کاموں کے لئے اور جہاد کے لئے اس وجہ سے سرمایہ نہ پاسکی ہوں کہ ان کی قوم سود کے بغیر اپنی حکومت کو روپیہ دینے پر آمادہ نہ تھی۔ لہٰذا آپ کا یہ دعویٰ کہ قرضِ حسن ناقابل عمل ہے اور قرض و استقراض کی عمارت صرف سود ہی پر کھڑی ہو سکتی ہے، کسی منطقی تردید کا محتاج نہیں ہے۔ ہم اپنے صدیوں کے عمل سے اسے غلط ثابت کر چکے ہیں۔

یہ بحث کہ آج اس زمانے کی معاشی ضروریات کے لئے قرض بلاسود کی بہم رسانی عملاً کس طرح ہو سکتی ہے، ہمارے اس باب کے موضوع سے خارج ہے۔ اس پر ہم بعد کے ایک باب میں گفتگو کریں گے :

ہمارا معاشرہ

اور

چند اجتماعی نفسیاتی وبائیں!

(نعیم صدیقی)

(۲)

اس مضمون کا آغاز گذشتہ اشاعت کے اشارات میں کیا گیا تھا لیکن اب کی اشارات میں ایک دوسرا مسئلہ چھیڑنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے، لہٰذا اس مضمون کو مقالات کی صف میں شریک کیا گیا ہے۔

(ادارہ)

بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جن کے جذباتِ حمیتِ دین اتنا وسیع ظرف نہیں رکھتے کہ نتائج کے رُونما ہونے کا وقت آنے تک صبر کے ساتھ مسلسل محنت کرتے چلے جائیں، بلکہ جب ان کی خواہش کے مطابق نتائج جلد رونما نہیں ہوتے عوام کی زندگیاں سرعت سے نہیں بدلتیں، اقتدار ہدایت کو قبول نہیں کرتا تو یہ دل برداشتہ ہونے لگتے ہیں کہ شائد حق کا غلبہ ممکن نہیں ہے۔

ان حضرات کی نگاہیں اگر اسلام و جاہلیت کی کشمکش کی تاریخ پر بھی ہوں تو انہیں اندازہ ہو کہ اسلام کی جنت کرۂ ارضی پر آراستہ کرنا کسی شعبدہ بازی سے ممکن نہیں، بلکہ یہ کام ایک لمبی محنت کا محتاج ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۲۳ سال کی محنت ایک صالح مستقبل کی تعمیر میں صرف کی ہے تب کہیں جا کے تاریخ کو ایک دورِ سعادت حاصل ہوا ہے۔ یہاں حکم یہ ہے کہ عمرِ نوحؑ دعوت الی اللہ میں کھپا دی جائے، چاہے بظاہر احوال قرنوں کی جدوجہد کے بعد خدا کا سپاہی نتائج کے متعلق یہی دردناک رپورٹ پیش کرنے پر مجبور ہو کر:۔

رب انی دعوت قومی	اے میرے رب! میں نے رات دن اپنی قوم کو
لیلا و نہارا فلم یزدھم	پکارا، لیکن میری پکار سے ان کا گریز بڑھتا ہی گیا!
دعاءی الا فرارا و انی	اور میں نے جب جب بھی ان کو اس غرض سے بلایا
کلما دعوتھم لتغفر لھم	کہ آپ انکی مغفرت فرمائیں تو انہوں نے اپنے
جعلوا اصابعھم فی آذانھم	کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اوپر سے کپڑے
واستغشوا ثیابھم واصروا	لپیٹ لئے پھر ہٹ سے کام لیا، اور اکڑبازی
استکبروا استکبارا (سورۂ نوح)	دکھائی ——— انتہا درجے کی اکڑبازی!

یہ وہ مہم ہے جسے عیسیٰ علیہ السلام شروع کرتے ہیں لیکن ان کی زندگی گذر جاتی ہے اور مہم سر نہیں ہوتی، بلکہ ان کا شروع کیا ہوا کام محمد صلے اللہ علیہ وسلم پورا فرماتے ہیں۔

اللہ نے انسانی تاریخ کے انقلابات کے جو قوانین اور طریقہ ہائے کار ٹھہرا رکھے ہیں ان میں جلد بازی کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ وہ کسان کے سے صبر کے متقاضی ہیں۔ سورۂ معارج میں انہیں قوانین کی ایک حقیقت یوں بیان کی گئی ہے:۔

سأل سائل بعذاب واقع	ایک مطالبہ کرنے والے نے ٹوٹ پڑنے والے عذاب کا
لیس للکفرین لہ دافع	مطالبہ کیا! حالانکہ سرکشی کرنے والوں کے پاس
من اللہ ذی المعارج تعرج	کوئی اسے ٹال سکنے والا نہیں ہے ——— اس اللہ کی
الملئکۃ والروح فی	جانب سے جو ارتقائی منازل کا مالک ہے!
یوم کان مقدارہ	(دنیا کا انتظام چلانے والے) ملائکہ اور ارواح
خمسین الف سنۃ	(احکام اور فیصلے لینے کے لئے) اس کی طرف زینہ
فاصبر صبرا جمیلا ۰	بزینہ صعود کرتے رہتے ہیں، ایک ایسے لمبے دن
	میں جس کی مقدار انسانی حساب کے لحاظ سے
	پچاس ہزار سال کی ہے!

پس اے نبی صلعم! صبر کرنے کے بہترین طریق سے صبر کیجئے۔

انہم یرونہ بعیدا ونرٰہ قریبا۔	یہ لوگ عذاب الٰہی کو بہت دور پاتے ہیں۔ لیکن ہم اسے بالکل قریب دیکھتے ہیں!

نبی صلعم اور آپ کے ساتھی جب دعوتِ حق دیتے ہوئے ایک عذاب کے انجام سے کفار کو ڈراتے تھے۔ تو وہ ان جانبازانِ حق کی نعوذ باللہ، حقیر سی قوت کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کے ذہن میں یہ بات سماتی ہی نہ تھی۔ کہ یہ چند آدمی قوم کی کایا پلٹ سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے ہم پر اللہ کی طرف سے خود ان کے ہاتھوں عذاب آسکتا ہے۔ چنانچہ مخالفین حق ان کو چیلنج کرتے تھے کہ دیکھو ہم ڈٹ کے حق کا انکار کر رہے ہیں پس کیوں نہیں تم عذاب لے آتے! اس طرحِ طنز و تعریض سے جانبازانِ حق کے جذبات پر بھی گہرا اثر پڑتا تھا، خود نبی صلعم کا دل بھی دکھتا تھا کہ یہ خدا کے احکام کو ٹھکرانے والے اور آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑانے والے زمین پر اقتدار جمائے کیوں دندناتے پھرتے ہیں: ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے حق کے سپاہیوں کو یقین دلایا کہ تبدیلی مقدر ہے، پانسہ پلٹ کے رہیگا، اقتدار اہل حق ہی کو ملے گا اور منکرین پر لازما عذاب آ کے رہیگا لیکن اس انقلاب کے لئے ہمارے قوانین ایک خاص تدریج سے کام کرتے ہیں' ز... سے کام لو ہمت ہارنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ جب بھی ... کیا جا رہا ہے' اس کے لئے کسی تبدیلی کا عندیہ تھا: درست نہیں ہے، کجا کہ اسلامی انقلاب کا نعرہ بلند کیا جائے!

اسی سلسلے میں دوسری جگہ فرمایا کہ:

ولکل امۃ اجل فاذا جاء اجلہم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون!	ہر گروہ کے لئے (اس کے احوال و اعمال کے لحاظ سے مہلت کار کے خاتمے کی) ایک گھڑی معین ہے پس جب وہ گھڑی آجاتی ہے تو نہ وہ اس سے ایک لمحہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں، نہ ایک لمحہ آگے بڑھ سکتے ہیں!

یعنی ہر قوم، ہر جماعت، حکومت، وزارت کے احوال و اعمال کے لحاظ سے اللہ کے ہاں ایک خاص حد تک مہلت کا تعین کی جاتی ہے اور اس کو اصلاح و ترقی کے لئے قانون امہال کے تحت با قاعدہ موقع دیا جاتا ہے جب تک یہ مہلت کار اور موقع اصلاح ختم نہ ہو جائے نئی طاقتوں کو پورے صبر کے ساتھ تبدیلی کی تکمیل کی جدوجہد جاری رکھنی ہوتی ہے لیکن جب یہ مہلت اور موقعہ ختم ہو جائے تو پھر اس میں اضافہ کرنا کسی کے بس میں نہیں!

حق و باطل کی کشمکش کا فیصلہ کرنا دراصل دنیا کی برسر اقتدار طاقتوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ خود اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ حقیقت جن لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، وہ اپنی مساعی کی کامیابی کے بارے میں شبہات اور ان کے نتائج کے ظہور کے بارے میں مایوسی میں مبتلا ہو جایا کرتے ہیں۔ مکہ کے اعیان حق کے گروہ میں جن لوگوں کے اندر اس قسم کے اثرات وقتی طور پر ابھر آیا کرتے تھے ان کی تسلی کے لئے قرآن نے نبی صلعم کی زبان سے یہ کہلوایا کہ:

قل انی علی بینۃ من
ربی وکذبتم بہ ط
ما عندی ما تستعجلون
بہ ط ان الحکم الا
للہ ط یقص الحق وھو
خیر الفاصلین ٥

ان سے کہدیجئے کہ میں تو اپنے رب کی طرف سے
اتاری ہوئی دلیل (دلیل حق) پر قائم ہوں، اور
تم نے اسے جھٹلایا! میرے بس میں وہ عذاب نہیں
جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو! اس کا
فیصلہ دینا اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں ہے
وہ حق کو واضح کرتا ہے۔ اور وہ بہترین فیصلہ کرنے
والا ہے!

(پ ۷ ع ۱۳)

وہ لوگ جو اپنے رب کی طرف سے نازل ہونے والے قطعی اور یقینی دلائل پر اپنی سرگرمیوں کی بنیاد رکھ رہے ہوں، ان کو ہر لحظہ یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ فیصلہ بہر حال اللہ کے اختیار میں ہے۔ اور وہ "خیر الفاصلین" ہے۔ اور اس نے اپنی تعریف میں خود کہا ہے کہ "ھو یقضی بالحق" یعنی وہ عدل کے ساتھ حساب چکاتا ہے! وہ مساعی کو نہ تو رائگاں جانے دینے والا ہے، نہ ان کے نتائج کے ظہور کے

ٹھیک وقت آ جانے پر کسی طرح کی تاخیر کرنے والا ہے۔ یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے رہے تو نہ بے صبری پیدا ہو سکتی ہے، نہ مایوسی!

مکہ میں جب کشمکش شدید تھی، اور آزمائشوں کی بھٹی گرم تھی اور حق کا داعی آنحضرت صلعم اس بات پر کڑھ رہا تھا کہ جن کی وہ خیرخواہی میں سرگرداں ہے، وہی اس کے دشمن ہو کر رہے ہیں تو اس وقت اسے مایوسی کی طرف مائل ہونے سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یوں خطاب کیا:

قد نعلم انه ليحزنك	ہم جان چکے ہیں کہ اے نبی صلعم آپ کو وہ یاوہ گوئی
الذي يقولون فانهم	جو یہ (انکار کرنے والے) لوگ کرتے ہیں دکھ دیتی
لا يكذبونك ولكن	ہے۔ سو یقین کیجئے کہ یہ آپ کو نہیں جھٹلاتے۔
الظالمين بآيات الله يجحدون ○	بلکہ یہ ظالم تو خود خدا کی آیات سے انکار کرتے ہیں۔
ولقد كذبت رسل	اور یہ معاملہ آپ ہی کو نہیں پیش آیا، آپ سے
من قبلك فصبروا على	پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا جا چکا ہے۔ اور پیغمبران کو
ما كذبوا واوذوا حتى	دکھ دیئے گئے لیکن انہوں نے اس روش پر
اتاهم نصرنا ولا مبدل	صبر کیا جس کے ذریعے انہیں جھٹلایا گیا تھا ——
لكلمت الله!	یہاں تک کہ ہماری مدد ان کو پہنچ گئی! اور اللہ کے
ولقد جاءك من	ان قوانین کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے!
نبأى المرسلين ○ و	اور اس تصریح کے باوجود اگر ان لوگوں کا اعراض
ان كان كبر عليك	تمہارے لئے ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ تو پھر
اعراضهم فان استطعت	دیکھ لو، کہ اگر تم زمین میں کوئی سرنگ کھود کر یا
ان تبتغي نفقا في الارض او	آسمان پر سیڑھی لگا کر کوئی فیصلہ کن آیت
سلما في السماء فتاتيهم	لا سکتے ہو۔ تو لا دو!
بآية - ولو شاء الله لجمعهم على	خود اللہ نے اگر چاہا ہوتا۔ تو وہ ان کو اکٹھے

الهدیٰ فلا تکونن من الجٰهلین ۝ پر جمع کر دیتا پس جذباتی نہ ہو!

نبی صلعم اور آپ کے رفقا کو متنبہ کیا گیا کہ لوگوں کے حق کو جھٹلانے اور اہل حق کو ایذا دینے کے رویے پر کڑھنا بیکار ہے اور غلبۂ حق میں دیر ہوتے دیکھ کر گھبرانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ حالات ہمیشہ داعیانِ حق کو پیش آئے ہیں، سبھی کو جھٹلانے والوں نے جھٹلایا، اور دُکھ دینے والوں نے دُکھ دیا ہے لیکن اس ساری کشمکش کے لئے کچھ خدائی ضوابط ہیں جو ہر دَور میں اپنا کام برابر ایک ہی نہج سے کرتے ہیں۔ اور ان کے تحت آخر کار معیّنہ نتائج نکل کے رہتے ہیں۔ لیکن اگر تم ان قوانین ـــــ کلمٰت اللہ ـــــ کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے جلد بازی برتتے ہو اور گھبراہٹ اور مایوسی میں پڑتے ہو تو پھر اگر جلدی سے کچھ کر دکھانا تمہارے بس میں ہو تو اپنی سی کر دیکھو۔ زمین میں سرنگ نکال کر کوئی فیصلہ کن آیت کھود نکالو یا آسمانوں پر سیڑھی لگا کر کوئی معجزہ اتار لاؤ! ظاہر ہے کہ تم قوانینِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر کچھ کر نہیں سکتے۔ لہٰذا کڑھنے اور بد دل ہونے کے بجائے صبر سے کام کرو، یکا جو سیدھا طریقہ ہے اس کو اختیار کرو اور محنت کرتے جاؤ!

پھر یہ بھی واضح کر دیا کہ:

فذکر انما انت مذکر!	پس آپ انھوحق کی یاد دہانی کرائیے، آپ صرف
لست علیهم بمصیطر	حق کی یاد دہانی کرانیوالے ہیں، ان پر اصلاح
	کے داروغے نہیں بنائے گئے!

یعنی تحریکِ حق کے سپاہیوں کا کام اصلاح کی جدوجہد ہے، نتائج کی ذمہ داری ان پر نہیں، وہ دعوت دینے کے ذمہ دار ہیں، لوگوں کے قلوب کو عملاً کسی جبر سے بدلنا ان کے سپرد نہیں کیا گیا! ان کا فرض انقلاب کی کوشش ہے، لیکن انقلاب کو عالم واقعہ میں برپا کر کے تکمیل تک پہنچانے کا تعلق اُن سے نہیں، خود اللہ سے ہے۔

دین کے جو خادم اپنی ذمہ داری کی حدود سے آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی ذمہ داریوں پر بھی ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں، ان کو پہلے قدم ہی پر مایوسی آگھیرتی ہے۔ اور وہ بد دلی کے ساتھ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہتے ہیں

کہ بس اب کچھ نہیں ہو سکتا!

دعوتِ حق اور تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کا کام بالکل ایک کسان کا سا ہوتا ہے۔ ایک مدت کھیتی کو تیار کرنے پر صرف ہوتی ہے، پھر اسے سینچنا ہوتا ہے، پھر اس میں بیج ڈالنا ہوتا ہے، پھر اس کے گرد باڑ کھڑی کرنی ہوتی ہے، پھر اس کی نلائی اور گوڑی کرنی ہوتی ہے، اور پھر صبر سے اس "اجلِ مسمّٰی" کا انتظار کرنا ہوتا ہے جبکہ وہ اپنا حاصل دے۔ اگر کسان بے صبرا ہو اور ہل جوتنے کے ساتھ ہی زمین سے مطالبہ کرے کہ فصل دے، یا بیج ڈالنے کے ساتھ ہی اس سے معاوضۂ محنت طلب کرے تو زمین اسے مایوسی و نامرادی کے سوا اور کچھ نہ دے سکے گی! ایسے ہی اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کو انسانی تمدن و سیاست کی کھیتی پر بڑے صبر کے ساتھ محنت کرنی ہوتی ہے اور نتائج کے لئے "اجلِ مسمّٰی" کا انتظار پورے سکون سے کرنا پڑتا ہے، تب کہیں جاکے کچھ حاصل پلے پڑتا ہے، ورنہ اگر بے صبری کا یہ عالم ہو کہ ادھر آپ بیج ڈال کے فارغ ہوئے، ادھر آپ بورے خرجیاں لے کے پہنچ گئے کہ بس اب پھلوں اور غلے کو گھر پہنچانا ہے، تو ظاہر بات ہے کہ پھلوں اور غلے کا تو کیا سوال وہاں تو کھیتی میں کوئی کونپل بھی پھوٹتی ہوئی نظر نہ آئے گی۔ ایسا بے صبرا کسان بددل اور مایوس ہی تو ہوگا! بے صبروں کے لئے موزوں پیشہ کاشتکاری نہیں، بلکہ بھیک مانگنا ہوتا ہے کہ ادھر سوال کیا اور ادھر کسی خدا ترس سے پکی پکائی روٹی مل گئی!

اللہ نے تحریکِ حق کے کارکنوں کے لئے صبر سے محنت کرنے کو لازم ٹھہرایا ہے۔ اس مطالبے کو پورا کئے بغیر اگر آپ دن میں ہزار مرتبہ بھی اس بات کے لئے دعائیں کریں کہ غیر اسلامی نظام کا قلع قمع ہو اور اسلامی نظام غالب ہو جائے تو ایسی دعائیں موجبِ ثواب بھی ــــ لیکن انقلابِ حق کے برپا کرنے میں یہ بالکل لاحاصل رہیں گی! ایسی دعاؤں میں جان اسی وقت آسکتی ہے کہ جب "تواصی بالحق" کے فریضے کو "تواصی بالصبر" کے ساتھ کوئی منظم جماعت انجام دے رہی ہو!

پس آپ حضرات اللہ کے قوانین کا طریقِ کار اگر ذہن نشین کر لیں تو پھر آپ مایوسی کے بھنور سے نکل سکتے ہیں، ورنہ اگر آپ نے کلمۃ اللہ کے مفہوم کو پیشِ نظر نہ رکھا اور ان کے تقاضے پورے نہ کئے تو آپ خود تو قنوطیت کا شکار بن گئے ہی، نہ جانے اور کتنے حوصلہ مند افراد کے دل توڑ

کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے، اور اس طرح اندیشہ ہے کہ آپ غلبۂ دین کی حمایت کے بجائے ایک طرح سے "صد عن سبیل اللہ" کے مجرم قرار پا جائیں۔ وقت ہے کہ آپ اپنے رازِ نگاہ کو بدل لیں اور اپنے دلوں میں امید اور یقین کے بیج بوئیں!

بھرت دلے مایوسین کا دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل ہے، جو مشکلات کو دیکھ کر ہول کھا جاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی صدقِ دل سے حق کے حامی ہیں، لیکن ان کا حال یہ ہے کہ جب تحریکِ حق کا قدم آگے بڑھتا ہے تو ان کے حوصلے رہیں کچھ کچھ جوان آنے لگتی ہے۔ اور چاہتے ہیں کہ کاروانِ اسلام میں بڑھ کے جا شامل ہوں۔ ابھی یہ آگے بڑھنے کے لئے پر تول ہی رہے ہوتے ہیں کہ تحریکِ حق کی کوئی نہ کوئی مشکل ان کے سامنے آجاتی ہے، بس مشکل سامنے آئی اور ان کے حوصلوں پر اوس پڑ گئی۔ یہی لوگ ہیں جن سے یہ فقرے سننے میں آتے ہیں، کہ:

"حق تو یہی ہے، مگر لوگ اسے سنتے نہیں"

"تحریک ٹھیک ہے، لیکن اسے کوئی چلنے کب دیتا ہے"

"اسلامی نظام ہمہ تن سعادت ہے۔ مگر اس کے مخالفین سخت رکاوٹیں ڈال رہے ہیں!"

——————— وغیرہ! اور ان فقرات کے پیچھے دنیا کی تاریک ترین ناامیدی جھلک رہی ہوتی ہے۔ ان حضرات کو اس وادی کے نشیب و فراز سے آگاہی ہے نہیں، جس میں سے ہو کے اقامتِ دین کی شاہراہ نکلتی ہے۔ یہ تو بلا تکلف حق کی طرف تیز رفتاری سے دوڑنے پر تیار ہیں، بشرطیکہ ان کو یقین دلا دیا جائے کہ سارے راستے میں قالین بچھے ہوئے ہیں، کارواں سرائیں بنی ہوئی ہیں، اور سبیلیں لگی ہوئی ہیں۔ بخلاف اس کے اگر ان کو یہ خبر ہو جائے کہ راستے میں کانٹے بھی آتے ہیں، جھاڑیاں بھی ہیں، چٹانیں اور کھائیاں بھی ہیں، بلندیاں اور پستیاں بھی ہیں، پیچ اور خم بھی ہیں تو پھر یہ ایک لمبی سانس لے کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اپنے نماز روزہ اور ذکر و تسبیح میں، یا کاروبار اور بیوی بچوں سے دلچسپی لینے میں لگ جاتے ہیں۔

صدیوں سے جامد مسلمانی میں پڑے پڑے ان کے ذہنوں نے دین کا وہ تصور ہی گم کر دیا ہے، جس کا

فتنہ مشکلات سے تحریک پیسنے کا دولہ پیدا کرتا ہے۔

ان کو معلوم نہیں کہ جو شخص بھی مسلم بنتا ہے اس کو اوّل قدم پر یہ انتباہ دیا جاتا ہے، کہ :-

احسب الناس ان یترکوا
ان یقولوا آمنا وھم لا
یفتنون ؟ ولقد فتنا
الذین من قبلھم فلیعلمن
اللہ الذین صدقوا
ولیعلمن الکاذبین

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ اس پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے — اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم نے ان سے پہلے کے لوگوں کی آزمائش کی ہے! پس اللہ ضرور ان لوگوں کو بھی جانے گا جو اپنے ایمانی دعوی میں صادق ہیں، اور وہ لازماً ان لوگوں کو بھی جانے گا جو اپنے ایمان کے دعوے میں جھوٹے ہیں!

کوئی تحریکِ اصلاح و انقلاب ایسی نہیں ایجاد ہو سکی — چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی — جو "آزمائش" کی وادیوں سے باہر باہر ہی سے اپنا راستہ نکال کر کامیابی کی منزل پر پہنچ جائے۔ خاص طور پر تحریکِ حق کو تو بہت ہی خطرناک گھاٹیوں سے گذرنا پڑتا ہے اور جب کہیں "اسلامی نظام" کے دروازے پر دستک دینے کی نوبت آتی ہے۔

اس حقیقت کو نہ جاننے والے لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے پر غداری کے خطابات بھی ملا کرتے ہیں، تخریب و انتشار پیدا کرنے کے الزام بھی لگا کرتے ہیں، پکڑ دھکڑ بھی ہوتی ہے، نکتہ چینی کی جاتی ہے، جھوٹے پروپیگنڈے سے پریشان بھی کیا جاتا ہے، مخالفانہ سازشیں بھی کی جاتی ہیں، گالیاں بھی دی جاتی ہیں، تو ان کے دل بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کو اس بات میں شبہ ہو جاتا ہے کہ ایسی مخالفتوں اور ایسی رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے بھی دینِ حق کا بول بالا ہو سکتا ہے۔ یہ شبہ فطرتاً مایوسی پر منتج ہوتا ہے۔ مخالفتیں کم ہو جاتی ہیں، تو یہ شبہ بھی دور ہونے لگتا ہے اور امید لوٹ آتی ہے۔ اور مخالفتیں بڑھتی ہیں، تو یہ شبہ بھی پھر ابھرتا ہے اور ان

کے ساتھ ساتھ قنوطیت طبائع پر مستولی ہونے لگی ہے۔

"مردانِ کار" کی فطرت دوسری ہوتی ہے۔ ان کو مقصد کی راہ میں جتنی جتنی مشکلات حائل نظر آتی ہیں، اتنا ہی اتنا ان کا عزم اور ولولہ ترقی کرتا ہے اور ان کی غیرت و حمیت بیدار تر ہوتی جاتی ہے لیکن مذکورہ حضرات کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے۔ کہ مشکلات کم ہوں تو ان کی ہمت بڑھتی ہے، مشکلات زیادہ ہوں تو ان میں مایوسی اور بددلی پیدا ہو جاتی ہے۔

مریضانِ یاس کی اس صنف میں دین کے حق ہونے اور خیر و فلاح ہونے میں کوئی تذبذب نہیں پایا جاتا، نہ ان میں نفاق کا وہ مادہ موجود ہے جس کی وجہ سے آدمی اپنی نفع پرستی اور آرام پسندی کی خاطر جان بوجھ کر دین کے مطالباتِ ایثار و فداکاری سے جی چراتا ہے، بلکہ اس کے خلاف یہ حضرات اپنے گرد و پیش کی مشکلات کو دیکھ کر دین کے غلبے کے امکان سے مایوس ہیں۔

درحقیقت اقامتِ دین کی عالمگیر تاریخ کے ابواب تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے نہیں ہیں، ورنہ ان کو اندازہ ہوتا کہ تحریکِ حق پہلے جن مشکلات کا مقابلہ کر کے فاتح بنتی رہی ہے، ان کے مقابلے میں آج کے حالات شائد بہت ہلکے اور قابلِ برداشت ہیں۔

کاش ان کو اس بات ہی کا اندازہ ہوتا کہ نبی صلعم اور آپ کے صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کن منازل سے ہو کے گذرے ہیں؟ آپ کے ساتھی جب مکہ میں پٹ رہے ہوتے تھے اور تپتی ریت پر لٹائے جا رہے ہوتے تھے تو بظاہر احوال کیا وہ اس کا تصور بھی کر سکتے تھے کہ ایک دن سارے عرب کا انتظام ان کے ہاتھوں میں ہوگا؟ آپ سوچیے کہ نبی صلعم جس دن طائف میں پتھر کھا رہے تھے اور جس دن آپ خانہ بدر ہو کر حرا میں پناہ گزیں تھے۔ اور جس دن مدینہ کے باہر تین سو تیرہ رفقاء کے ساتھ ایک فیصلہ کن بازی کھیلنے جا رہے تھے، کیا اس وقت ظاہری مشکلات کا حساب کرنے والوں کے نقطۂ نظر سے اس کا کچھ بھی امکان نظر آتا تھا کہ یہ مشکلات میں گھرا ہوا انسان نہ صرف یہ کہ مکہ میں فاتح بن کر داخل ہونے والا ہے، بلکہ روم و عجم کی سلطنتوں کی باگ ڈور بھی اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں آنے والی ہے؟

لیکن اس "انقلابی" کو اللہ کے قوانین و سنن پر اور اس کے وعدوں پر پورا پورا بھروسہ تھا، اور وہ اول روز

سے ہی یہ جانتا تھا۔ کہ مشکلات کے طوفان کتنے ہی اٹڈیں تحریک حق کے لئے نامرادی کی کوئی وجہ نہیں! چنانچہ اس نے شدید مشکلات میں گھر کر بھی پورے اطمینان سے حق کے زریں مستقبل پر نگاہیں جما کر مخالفین حق کو چیلنج کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

فانتظروا انی معکم من	پس آنے والے حالات کا تم بھی انتظار کرو۔ اور میں
المنتظرین!	بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں

اس کے سامنے اپنے اللہ کے متعلق یہ یقینی حقیقت تھی کہ:

انه لایفلح المجرمین	وہ مجرمین کو کبھی فلاح وکامرانی نہیں دیتا۔

اور اسے اس پر بھی بھروسہ تھا کہ:

والعاقبة للمتقین	اور (حق وباطل کی کشمکش میں) انجام کار (کا غلبہ)
	اہل تقویٰ کے لئے ہے!

ان حقیقتوں کو نہ جاننے کی وجہ سے مشکلات سے گھبرا کر موسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں پر بھی مایوسی کا دورہ پڑا تھا۔ اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی تھی جس کا بیان اس آیت میں ہے:۔

قالوا اوذینا من قبل ان	انہوں نے کہا کہ ہم کو تمہارے آنے سے پہلے بھی
تاتینا ومن بعد ما جئتنا	ستایا گیا ہے اور تمہارے آنے کے بعد بھی (ستایا جا
	رہا ہے)

موسیٰ علیہ السلام نے اس کا جواب یوں دیا کہ:

قال عسے ربکم ان	موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ وہ وقت دور نہیں کہ
یھلك عدوکم ویستخلفکم	تمہارا رب تمہارے دشمن کو تباہ کر دے اور تم کو زمین
فے الارض فینظر کیف	میں اپنا نائب قرار دے اور پھر دیکھے تم (اقتدار
تعملون ہ	پا کر) کیا روش اختیار کرتے ہو!

اس جواب سے صاف ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام مشکلات کے طوفان کو عبور کرتے ہوئے ساحل مراد

کو دیکھ رہے تھے کہ وہ سامنے ہے اور اپنے ساتھیوں کی نگاہوں کو بھی انہوں نے اس پر جمانے کی کوشش کی۔ اس قسم کے لوگ جو مخلص ہو کر مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے قنوطیت کا شکار ہوتے ہیں، اپنے مرض کے لئے بہترین علاج سورۂ آلِ عمران کی ذیل کی آیات میں پائینگے :-

ولا تھنوا ولا تحزنوا
وانتم الاعلون ان کنتم مومنین
ان یمسسکم قرح فقد مس
القوم قرح مثلہ ۰ وتلک
الایام نداولھا بین الناس ج
ولیعلم اللہ الذین امنوا و
یتخذ منکم شھداء ۰ واللہ
لا یحب الظلمین ۰ ولیمحص
اللہ الذین امنوا ویمحق
الکفرین ۰ ام حسبتم
ان تدخلوا الجنۃ و
لما یعلم اللہ الذین
جاھدوا منکم و
یعلم الصبرین ۰

اور نہ ڈھیلے پڑو اور نہ ملول ہو، اور یقین رکھو کہ
تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم سچے مسلمان ہوئے!
اگر تمہیں راہِ حق میں (کوئی) زخم لگا ہے تو تم سے پہلے
لوگ بھی (ایسے) زخم کھا چکے ہیں۔ اور ہم یہ سلسلۂ
ایام کو لوگوں کے سامنے گھماتے رہتے ہیں۔ اور یہ
اس لئے کہ اللہ جان لے کہ تم میں سے سچے مومن
کون ہیں اور تم میں سے بعض کو شہادت کے لئے منتخب
کر لے! ---- اور (جان لو کہ) اللہ ظالموں کو
پسند نہیں کرتا۔ اور پھر یہ (حالات کی آزمائش)
اس لئے ہے کہ اللہ ایمان والوں کو نکھارے
اور انکار کرنے والوں کو محو کر دے۔ کیا تم نے یہ سمجھ
رکھا ہے کہ تم یونہی جنت میں جا پہنچو گے حالانکہ
اللہ نے ابھی جانچ کے دیکھا ہی نہیں کہ کون تم میں
سے جد و جہد کرنے والے ہیں اور یہ ضروری ہے کہ
وہ جانچ کے دیکھے کہ جم کر رہنے والے کون ہیں!

وکاین من نبی قتل معہ
ربیون کثیر فما وھنوا
لما اصابھم فی سبیل اللہ و

کتنے ہی نبی تھے جن کے ساتھ ہو کے خدا کے جتھا جتھا لوگوں
نے جنگ کی۔ پھر وہ اللہ کی راہ میں پیش آنے والی
مشکلات سے نہ گھبرائے نہ سست پڑے اور نہ دبے

ما ضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصبرین ○	گئے۔ اور اللہ ثابت جانے والوں کو پسند کرتا ہے۔

ان آیات میں یہ یقین دلایا گیا ہے کہ اگر تحریکِ حق کے تقاضائے جہاد کو پورا کرنے میں کوتاہی نہ کی جائے اور کارکنانِ حق میں ایمانِ صادق موجود ہو تو پھر آخری غلبہ ان کا ہے۔ دوسری طرف یہ واضح کر دیا گیا کہ جنت کو جانے والی راہ بہرحال آزمائش کی وادیوں سے ہو کے نکلے گی اور جو لوگ ان وادیوں سے بالا بالا اپنا راستہ نکالیں، ان کو جنت پر نگاہیں مرتکز رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ ساتھ کے ساتھ اس بات سے روکا گیا کہ مسلمان وہن ضعف اور قنوطیت کا شکار ہونے لگیں اور حالات کی ذرا ذرا سی تلخی پر جی چھوٹ جائیں۔

ان آیات کو ہمارے "تھڑدلے" اسلام پسند حضرات کو تعویذ بنا کے رکھنا چاہیئے توقع ہے کہ ان سے ان کے حوصلے بلند ہو سکیں گے۔

علاوہ بریں اللہ کے یہ وعدے جن کی تلاوت بے سمجھے بوجھے کی جاتی ہے، اسلام کے خدمتگزاروں کے لئے جذبہ انگیز ہیں۔ اور یہ یقین و عزم کی روشنی سے دلوں کو منور کر سکتے ہیں، لہٰذا ان کو سمجھ بوجھ کے پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے:-

(۱) کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی، ان اللہ قوی عزیز ○	اللہ نے (یہ فیصلہ) لکھ رکھا ہے کہ لازماً میں اور میرے رسول (اپنے مخالفین پر) غالب ہو کے رہیں گے! بلاشبہ اللہ قوت اور غلبے والا ہے!
(۲) حقا علینا نصر المومنین	ہم پر یہ حق آتا ہے کہ ہم (حق و باطل کی کشمکش میں) اہلِ ایمان کی امداد کریں!
(۳) ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملئکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم	وہ لوگ جو کہتے ہیں۔ کہ اللہ ہمارا رب ہے۔ اور پھر (اس قول پر) جم جاتے ہیں، ان پر ہماری طرف سے فرشتے (یہ پیغام لے کر) اترتے ہیں، کہ کسی طرح کا خوف کرو نہ ملال، اور بشارت ہو اس جنت کی جس کا

توعدون ، نحن اولیاء کم فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ الخ

تمہیں وعدہ دیا گیا ہے۔ ہم خود دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں تمہارے کارساز ہیں!

وقال اللہ انی معکم لئن اقمتم الصلوۃ واتیتم الزکوۃ وامنتم برسلی وعزرتموھم واقرضتم اللہ قرضا حسنا

اور اللہ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہونگا۔ بشرطیکہ تم نے نماز کو قائم کیا، زکوٰۃ دینے کا اہتمام کیا، میرے رسولوں اور ان کے مشن پر ایمان لاتے رہے، اور ان کو جہاد حق میں غالب کرنے کی کوشش کی۔ اور اقامتِ دین کیلئے اللہ کو دہن و مال کی قربانیوں کی صورت میں قرض حسنہ دیا:

یہ وہ وعدہ ہائے حق ہیں جن سے اگر نگاہیں ہٹ جائیں تو آدمی بزدل، مایوس اور نامراد ہو کے رہ جاتا ہے لیکن اگر اللہ کے ان وعدوں پر توجہ رہے، ان پہ بھروسہ رہے تو پھر امید ویقین کے چراغ سینوں میں روشن رہتے ہیں اور قلت وکثرت تعداد ووسائل سے آدمی ایمان وکفر کی کشمکش کے انجام کا حساب نہیں لگاتا! ہمارے بھڑ دیے قنوطیوں کو ان وعدوں پر اعتماد قائم کرنے کی فکر کرنی چاہیئے!

ان کوتاہ ظرف حضرات کا تیسرا طبقہ ایک اور مرض میں مبتلا ہے۔ وہ یہ کہ جب اس طبقے کو ایک مخالف قوت برسر اقتدار نظر آتی ہے اور خدا کے پیدا کئے ہوئے بیشمار وسائل واسباب اس کے قبضے میں نظر آتے ہیں اور جب یہ ان وسائل واسباب کو حق کی مزاحمت اور باطل کے غلبے کے لئے پئے درپے استعمال ہوتا ہوا دیکھتا ہے۔ اور جب برسر اقتدار قوت کی چنت پھرت اسے مرعوب کرتی ہے تو اس کے ذہن میں یہ اثر اُبھرتا ہے کہ بس جو غلط کار لوگ ایک مرتبہ غالب ہو گئے ہیں غلبہ واقتدار کی اجارہ داری ہمیشہ کے لئے ان کے حصے میں آگئی ہے۔ اس طبقے کے لوگ یہ تصور کرنے سے قاصر ہیں کہ جو تخت ایک مرتبہ بچھ چکا ہے وہ کسی طرح الٹا جاسکتا ہے۔

یہ بیماری پہلے زمانوں میں پائی گئی ہے۔ پہلے بھی "قوم اجبارین" کا رعب قلوب انسانی پر اسی طرح اثر ڈال چکا ہے۔

جب فرعون اور اس کے درباریوں نے بنی اسرائیل پر ظلم وستم توڑنے کی اسکیم بنانے کی ٹھانی اور یہ ثابت کرنے پر تل گئے تھے کہ:

انا فوقهم قاهرون! — ہم ان کے اوپر پورا پورا تسلط رکھتے ہیں۔

تو بنی اسرائیل میں سے اہل ایمان بھی فرعون کے اس عملی دعوے سے مرعوب ہوئے تھے۔ اس موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ فرعون اور اس کی حکومت سب خود اللہ کے تسلط میں گھرے ہیں۔ اور زمین پر دعوائے قاہری کرنے والوں کی حیثیت خدا کے سامنے کٹھ پتلیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہ بادشاہ اور وزیر مشیت ربانی کی شطرنج کے شاہ و وزیر ہیں اور بس! چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے اس قول میں یقین وعزم کو جلا دینے والا جوہر ایک بڑی مقدار میں شامل ہے:-

استعينوا بالله واصبروا ان الارض لله يورثها من يشاء من عباده والعاقبة للمتقين!

اللہ سے مدد طلب کرو اور جمے رہو، یقیناً یہ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اور یقین رکھو کہ کفر و ایمان کی کشمکش میں آخری کامیابی اہل تقویٰ کے لئے ہے!

اللہ کا یہ قانون اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جب کچھ لوگ حق کو لے کر اٹھ کھڑے ہوں، اس پر جم جائیں اور آزمائشوں کے موقعوں پر اللہ سے استعانت چاہیں، ان شرائط کو پورا کرتے ہوئے جو خود اس کی طرف سے مقرر ہیں تو پھر لازماً آخرکار فتح انہیں کی ہوتی ہے؛ اور وراثتِ ارضی ان کو ہی دی جاتی ہے، چاہے بظاہر احوال مقابلہ کرنے والی فاسد قوت کا ٹھاٹھ باٹھ کتنا ہی مستحکم اور اٹل محسوس ہوتا ہو۔

یہ سنت اللہ اتنی اٹل ہے کہ اس کے بدلے میں بڑی بڑی قومیں، بڑی بڑی سلطنتیں اور بڑے بڑے

کبر و استکبار کے دعوے، محل اور قصور، باغات اور چمن، لشکر اور اسلحہ بہ جاتے ہیں! یہ قانون ایسا بے پناہ قانون ہے کہ قلّت کے ہاتھوں سے کثرت کو اور بے سرو سامانی کے ہاتھوں سے سرو سامان کو شکست دلوا دیتا ہے۔ اس قانون کے تحت جب انقلاب آتے ہیں تو ایسے ایسے عجیب و غریب طریقوں سے آتے ہیں کہ پیشتر سے اُن کے آنے کے راستے کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی آمد "من حیث لا یحتسب" کی حقیقت کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ قانون ایک بے پناہ قوت ہے جس نے بارہا تمدن انسانی کو زیر و زبر کر دیا ہے، جس نے نیچے کے طبقوں کو اوپر اور اوپر کے طبقوں کو نیچے پہنچا دیا ہے، جس نے مظلومی کو اختیار دے دیا ہے۔ اور جبّاری کو عاجزی کے مقام پر پہنچا دیا ہے۔ اس قانون سے جس کی نگاہ ہٹی ہوئی ہو وہ اسلام کے مورچے کا سپاہی بن کر کبھی نہیں لڑ سکتا۔

یہی قانون ہمارے بھترڈ لے ہوؤں کے ایک طبقے کی نگاہ سے اوجھل ہے اور اسی وجہ سے وہ وقت کے اقتدار سے مرعوب ہو کر آناً فاناً اپنے آپ کو مایوسی کے حوالے کر رہا ہے۔ اِن لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ کسی ایسی طاقت کو شکست دینا ممکن ہے جو حکمران ہو، جس کے پاس روپیہ ہو، جو جاگیریں رکھتی ہو، جو اچھا کھاتی ہو اور اچھا پہنتی ہو، جس کے پاس ریڈیو ہو، جس کے قبضے میں پریس ہو، جس کے ساتھ ہزارہا زرخرید نقیب ہوں، جس کے گرد قصیدہ خوانوں کا ایک ہجوم ہو، جس کے لئے راستوں میں فرش بچھتے ہوں، جس کے حضور میں سپاس نامے پڑھے جاتے ہوں، جس کے استقبال کئے جاتے ہوں، جس کی خواہش قانون و عدالت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہو، جس نے پروپیگنڈے کے طوفان اٹھا رکھے ہوں — خصوصاً اس صورت میں کہ ایسی بے پناہ قوت کو چیلنج کرنے والوں کی تعداد کم ہو، ان کے پاس سرمایہ کم ہو، ان کے پاس ذرائع و وسائل کم ہوں، اور ان کو طرح طرح کی مشکلات در پیش ہوں۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے ذہن کی ترازو میں دونوں طرف کو تولتے ہیں اور مادیت کے باٹوں سے تولتے ہیں تو دونوں کے وزن میں بہت بڑا فرق نظر آتا ہے، تو جذبۂ اسلام دوستی رکھنے کے باوجود ان کے سینے دھک دھک سے رہ جاتے ہیں اور پھر یہ ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے سوا اور کچھ کرنے کی ہمت کھو بیٹھتے ہیں!

حالانکہ اقتدار کی امانت کو مشیّت اپنے جس قانون کے تحت ایک طاقت سے دوسری طاقت کی طرف منتقل کرتی ہے، وہ افراد کی تعداد اور مادی وسائل کی مقدار کے حساب سے نافذ نہیں ہوتا، بلکہ اس کا نفاذ کچھ دوسرے امور کو ملحوظ رکھ کر کیا جاتا ہے۔

دنیا کا کوئی اقتدار بھی ہو، اسے جو لوگ آنکھوں کے سامنے کام کرتا دیکھتے ہیں، ان کو وہ ہمیشہ اٹل ہی محسوس ہوتا ہے۔ اور ان کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ اس میں کدھر سے کوئی رخنہ ہے جس میں سے انقلاب اپنا راستہ نکالے گا۔ لیکن مشیّت الٰہی جب انقلاب لانے کے حق میں ہو جاتی ہے تو اقتدار کے قلعوں میں ہر طرف رخنے ہی رخنے نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر جب واقعہ ہو چکتا ہے تو ہر ایک کی سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے۔ کہ یہ یوں ہُوا!

انقلابات کے پیچیدہ قوانین کے طریق کار کا صحیح علم تو خود قانون ساز عالم ہی کو ہے، اور وُہی دراصل مختارِ مطلق ہے جو نظاموں کو زیروزبر کرتا ہے۔ چنانچہ اسی کا ارشاد ہے کہ:۔

اولم یسیروا فی الارض	کیا یہ لوگ گھومتے نہیں زمین میں۔ کہ دیکھیں ان
فینظروا کیف کان عاقبۃ	سے پہلے کے دشمنانِ حق کا انجام کیا ہُوا؟
الذین کانوا من قبلھم	حالانکہ وہ قوت واقتدار میں ان سے بڑھے ہوئے
کانوا اشد منھم قوۃ و اٰثارًا	تھے۔ اور زمین میں انہوں نے زیادہ آثار چھوڑے
فی الارض فاخذھم اللہ	ہیں! پس اللہ نے ان کو ان کے جرائم پر پکڑ لیا
بذنوبھم وما کان لھم من اللہ	اور پھر ان کو اللہ کی گرفت سے بچانے والا
من واق ٥ (المومن)	کوئی نہ تھا!

یہ آیت ایک طرف ان لوگوں کے استکبار کی تردید کرتی ہے جو اپنی قوت کو برا پائندار سمجھتے تھے اور دوسری طرف ان اہل ایمان کے یقین وعزم کو بیدار کرتی ہے جو مخالفین کے تمکن سے دل ہی دل میں ہول کھاتے اور اس تمکن کے خاتمے کے امکان سے مایوس تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے سخت مایوس کن حالات میں نبی صلعم کی زبان سے اہل ایمان کو یہ درس دلوایا کہ:

قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر ۔ تولج اللیل فی النھار وتولج النھار فی اللیل وتخرج الحی من المیت وتخرج المیت من الحی وترزق من تشاء بغیر حساب ٥

کہو کہ اے اللہ! اے سلطنت کے مالک! تو جسے چاہے ملک عطا کرے اور جس سے چاہے ملک چھین لے، اور تو جسے چاہے غلبہ دے اور جسے چاہے پست کر دے ــــ تو رات کو دن میں پروتا ہے اور دن کو رات میں پروتا ہے۔ اور تو مردے سے زندے کو نکالتا ہے اور زندے سے مردے کو نکالتا ہے۔ اور تو جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

یعنی انسانی تاریخ کے سارے انقلابات کی باگ دوڑ خود اللہ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنے قوانین کے مطابق ادھر سے سلطنت چھینتا ہے، ادھر سونپتا ہے، ایک طرف عزت و غلبہ عطا کر رہا ہوتا ہے، دوسری طرف سے عزت و غلبہ کے عطیے واپس لے رہا ہوتا ہے۔ ابھی رات میں سے دن کو نکال دکھاتا ہے، ابھی دن میں سے رات کو برآمد کر لیتا ہے، وہ اپنی حکمت کے تحت زندہ طاقتوں کو موت بھی دیتا ہے اور مردہ قوتوں کا احیا بھی کرتا ہے ــــ وہ اپنے خزائنِ رزق میں سے فرد یا گروہ پر بے حساب بارانِ رحمت کرتا ہے اور جس کا حصہ چاہتا ہے بکھیر دیتا ہے۔

یہ آیت نبی صلعم کے رفقا کو مشکل ترین مراحل میں سے گذرتے ہوئے بشارت دینے آئی تھی اور اس میں درحقیقت آنے والے انقلاب کی صبح کے ظہور کا مژدہ پنہاں تھا۔ اس نے اہل ایمان کو یہ اشارہ دیا کہ اللہ تعالیٰ مقررہ وقت کے آتے ہی جب سلطنت کی باگ دوڑ نا اہلوں سے چھین کر تم کو دینے پر آئیگا تو ان لوگوں کی طاقتیں اس کے فیصلے میں حائل نہ ہو سکیں گی، وہ جب تمہارے غلبے کے لئے اور تمہارے مخالفین کی ذلت کے لئے حکم صادر کر دیگا تو اس حکم کو تلواروں اور نیزوں کی کثرت نہ ٹال سکے گی، اور جب زندہ اقتداروں کے لئے موت کا پیغام دیگا اور تم کو نئی زندگی کا سربراہ کار بنانے کا آخری

فرمان نافذ کردیگا تو کسی کی دولت و امارت اس کے آڑے نہ آسکے گی، وہ جب تمہارے حصے میں کامرانی کی صبح مقدر کردے گا اور تمہاری مزاحمت کرنیوالوں کی جھولی میں نومیدی کی رات ڈال دیگا تو اس انقلاب احوال کو ٹالنا کسی کے بس میں نہ ہوگا تو یہ سارے اختیارات خود اللہ ہی کے قبضے میں ہیں!

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے دور نہ جائیے، کل کے جرمنی کو پیش نظر رکھ کر سوچئیے! --- کیا ۱۹۳۹ء سے پہلے کسی کو بھی یہ توقع تھی کہ جرمنی کی عظمت بہت جلد ختم ہو جانے والی ہے؟ کیا کوئی یہ پیشین گوئی کرسکتا تھا کہ جاپان کی سطوت زوال کے سیلاب کی زد میں آچکی ہے؟ کیا ۱۹۴۳ء میں یہ تصور کیا جاسکتا تھا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو انگریزی حکومت برِ اعظم ہند سے قطعی طور پر برطرف ہو جائے گی؟ کیا کسی کو یہ اندازہ تھا کہ تقسیم ہند اتنی آسانی سے واقع ہو جائیگی؟ کیا کبھی خضر وزارت کو ۱۹۴۶ء میں اس بات کا شبہ بھی گذرا ہوگا کہ ۱۹۴۷ء میں اس کا وجود حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا اور اسکی پشت پناہی کرنیوالی پارٹی کا نام تک لینا پنجاب میں ممکن نہ رہے گا؟ کیا مجلس احرار کو تقسیم سے پہلے یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اسے سیاسیات سے دست بردار ہونا پڑیگا؟

یہ سارے واقعات ہمارے سامنے ہوتے ہیں اور آج ان واقعات کے ہو چکنے کے بعد تو ہم ان کی توجیہ آسانی سے کر لیتے ہیں، لیکن ان کے واقع ہونے سے قبل بظاہر ان کے واقع ہونے ——— اور جلد واقع ہونے ——— کے بارے میں ہم کبھی تصور نہیں کر سکتے تھے!

تاریخ کے تغیرات کی یہ اعجوبگیاں بتاتی ہیں کہ یہ سارا انتظام اس ہستی کے ہاتھ میں ہے جس کی تعریف کیلئے "ھو القاھر فوق عبادہ" کے الفاظ بہت ہی موزوں ہیں

پس بندوں کے عارضی اقتدار کے ٹھاٹھ باٹھ سے مرعوب ہونیوالوں کو اپنی توجہ اس اصل مختار کار کی طرف منعطف کرنی چاہیئے جس نے "تلك الايام نداولها بين الناس" کا دعوٰے کیا ہے۔ اس سے معاملہ درست کرنا چاہیئے اور اس کے قوانین کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہیئے، پھر بندوں کی کوئی طاقت ایسی نہیں جو دینِ حق کی تحریک کا راستہ روکنے کے لئے تمہارے آڑے آسکے!

خدا کے دین سے آزاد جو اقتدار بھی پایا جاتا ہے، اس کے وارث خدا کے قوانین کے لحاظ سے اہلِ حق کے مقابلے میں نہایت گھٹیا، نہایت بودی اور ناپائیدار پوزیشن رکھتے ہیں۔ ان کے شان و شوکت کے سارے اسباب اور مظاہرۂ قوت کے جملہ وسائل خود ان کے لئے عذاب بنا دیئے جاتے ہیں، جیساکہ اصل نفاق کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔

فلا تعجبک اموالهم	(اے نبی!) ان کے مال اور اولاد تم کو مرعوب
ولا اولادهم انما یرید الله	نہ کریں؟ اللہ صرف یہ ارادہ رکھتا ہے کہ
لیعذبهم بها فی الحیوة الدنیا	ان کے ذریعے انہیں دنیا کی زندگی میں عذاب
	دے!

ایسے ہی اسلامی تحریک کی مزاحمت کرنے والے کفار کے متعلق فرمایا کہ:

لا یغرنك تقلب الذین	تم کو بستیوں میں ان لوگوں کی چلت پھرت دھوکے
کفروا فی البلاد متاع	میں نہ ڈال دے، جنہوں نے انکار کی روش
قلیل ثم ماوٰهم	اختیار کی! — یہ استفادہ قلیل ہے! پھر
جهنم وبئس المهاد	ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی بری
	منزل گاہ ہے!

اس قسم کی آیات کا منشا یہ واضح کرتا ہے۔ کہ دنیا میں انسانی طاقتوں کی چمک دمک اور ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر یہ سمجھنا کہ براہِ راست اختیار و اقتدار ان کو مل گیا، یا اِن کی اجازت لئے بغیر (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کوئی تبدیلی بپا کرنے والا نہیں، یا ان کی قوتیں مشیّت کے فیصلوں کے آگے بند باندھ سکتی ہے، غلط ہے! قوانینِ حق کے تقاضے پورے کرنے والا گروہ جب آگے بڑھتا ہے تو پہاڑ جیسی طاقتیں بھی اس کے سامنے نہیں جم سکتیں!

خدا کی اطاعت میں جو فرد اور جو گروہ کام کر رہا ہے اور جس کا نصب العین رضائے الٰہی ہو اور جو نصرتِ خداوندی کو حاصل کرنے کے تقاضے پورے کر رہا ہو، اس کی نگاہ تو اتنی بلند ہونی

چاہیئے، کہ وہ مقام عبدیت سے جب نیچے کی طرف جھانکے تو اسے فراعنہ اور نمارد چیونٹیوں کی طرح اور تنکوں کی طرح بے وزن معلوم ہوں! اتنے علوِ نگاہ کے بغیر خدا کے دین کو غالب کرنے کا بیڑا نہیں اٹھایا جا سکتا۔

پس لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اگر واقعی اسلام کے نظام کو قائم کرنے کے حق میں ہیں تو تفرقے پن کو ختم کر دیں اور جھوٹے اقتدار عل کی مرعوبیت سے باہر نکلیں اور مایوس ہو کر بیٹھنے کی بجائے اللہ کے ان کم سے کم مطالبات کو پورا کریں جو ایک انقلاب حق کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں!

خریداران ترجمان القرآن سے التماس

(۱) چندہ کے منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ صاف اور خوشخط لکھئے۔ (خصوصاً ڈاک خانہ اور ضلع کا نام واضح طور پر درج کیجئے۔) سابق نمبر خریداری بھی تحریر فرمایئے۔

(۲) وقتی طور پر اگر ایک دو ماہ کے لئے پتہ تبدیل کرانا ہو تو براہ کرم اپنے ڈاک خانہ کو نئے عارضی پتہ پر پرچہ Re-direct کرنے کی ہدایت کر دیا کیجئے اور مستقل طور پر پتہ بدلنا ہو تو رسالہ کے دفتر کو لکھئے ورنہ بار بار اندراجات کو بدلنے سے دفتر باقاعدگی کو برقرار نہیں رکھ سکتا نیز تبدیلی پتہ کی فرمائش ۲۰ تاریخ تک دفتر کو پہنچ جانی چاہیئے۔ جس میں پہلا پتہ اور نیا تبدیل شدہ پتہ دونوں نمبر خریداری کے حوالے کے ساتھ درج ہوں۔

(۳) اجرائے رسالہ کے لئے پیشگی چندہ بھیجئے یا وی۔ پی کی اجازت دیجئے تعرض یا وعدے پر رسالہ جاری نہیں کیا جاتا ہے (۴) رسالہ ترجمان القرآن کے معاملات میں مرکز جماعت کے کسی دوسرے شعبے کو مخاطب نہ کیجئے اور نہ دوسرے شعبوں سے متعلقہ امور ہمارے دفتر کے معاملات میں خلط ملط کر کے لکھئے اگر خدانخواستہ آپ ان گذارشات کو نظر انداز کریں گے تو دفتر کی مجبوراً کوتاہیوں کی ذمہ داری آپ پر ہوگی

(منیجر)

اشارات کا بقیہ !

(صفحہ ۱۲ سے آگے)

میں سارا اختیار مرکز جماعت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ چنانچہ آج تک جو اخراج بھی عمل میں آیا ہے وہ اصلاح کی کوششوں کو بار بار آزمانے اور متعلقہ افر متنبہ کرنے کے بعد عمل میں آیا ہے۔

ایک اصلاحی و تعمیری جماعت کا اصل کام کاٹ پھینکنا اور دھکیلنا نہیں ہو سکتا، بلکہ اسکی کوششیں ہمیشہ یہی ہو سکتی ہیں کہ وہ گرتوں کو سہارا دے، کمزوروں کی ہمت بندھائے، بگڑتوں کو سنوارے اور جن لوگوں نے اپنے آپ کو خدمت دین کے لئے ایک مرکز پر سمیٹا ہو، انہیں کھینچ کھانچ کے ساتھ لے چلنے کی ساری تدابیر عمل میں لائے۔ اخراج تو صرف ایک مجبورانہ اقدام ہوتا ہے!

اقامتِ دین کی جدوجہد بہر حال انسانوں ہی کے ذریعے چلے گی، اور انسانوں میں بہر صورت کچھ نہ کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں، کسی میں کم کسی میں زیادہ، کسی میں ظاہر کسی میں پنہاں، پس مجرد کسی کمزوری اور کسی غلطی کے صدور پر نہ اللہ تعالیٰ کسی بندے پر اپنی رحمت کے دروازے بند کرتا ہے اور نہ ایک خدا پرست جماعت کا یہ منصب ہو سکتا ہے کہ وہ محض کسی فرد سے غلطی سرزد ہو جانے پر اُس پر اصلاح کے دروازے بند کر دے۔

وہ غلطیاں جو سہواً یا ناتربیت یافتگی کی وجہ سے یا کسی اچانک جذباتی حملے کے تحت محض بشری کمزوری کے طور پر سرزد ہو جائیں، ان کیلئے جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کے دروازے کھلے ہیں، اسی طرح اللہ کے دین کی خدمت کرنیوالی جماعت کے ہاں بھی اصلاح کے مواقع موجود رہنے چاہئیں۔ واضح رہے کہ بڑے سے بڑا مومن بتقاضائے بشریت بڑی سے بڑی غلطی کر سکتا ہے لیکن اگر وہ گناہ میں بالکل ہی بہک نہ جائے تو وہ اپنے دامن سے بڑے سے بڑے گناہ کے دھبے کو جذبۂ ندامت کے ذریعے دھو کر از سرِ نو ایک مومنِ صالح کی حیثیت پر قائم ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر دوسری طرف ایک گناہ کو سوچ سمجھ کر کیا گیا ہو، اُس سے مسلسل لذت اندوزی یا نفع اندوزی کی جائے، یا اسے باقاعدہ پرورش دی جائے اور گناہ سرزد ہونے کے بعد فوراً اس امر کا کوئی ثبوت نہ ملے کہ جذبۂ انابت اور طرزِ عمل کی اصلاح کی فکر برسرِ عمل ہے تو معصیت کی یہ صورت ایسی ہے کہ اسے ایک ایسی جماعت اپنے حلقہ کے اندر گوارا نہیں کر سکتی جو اقامتِ دین [illegible] کشمکش کے مراحل سے گزر رہی ہو!

ان صورتوں کے علاوہ غلطیوں کی ایک قسم ایسی بھی ہوسکتی ہے کہ اگرچہ غلطی کرنے والا غلطی سے تائب ہوکر اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوجائے، لیکن اس کی غلطی ایسے مستقل اثرات چھوڑ دے کہ اسکو ساتھ رکھ کے چلنا پوری تحریک کے لئے بہت بڑی مضرتیں رکھتا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ایسی غلطیوں کے بارے میں اللہ کی مغفرت کا استحقاق ایک فرد میں پیدا ہوجائے لیکن جماعت نازک حالات سے گذرتے ہوئے اسکو ساتھ رکھ کے چلنے سے معذور ہو۔

اخراج کے بارے میں نہایت محتاط ہونے کے باوجود یہ بات بھی ضروری ہے کہ جب اس آخری چارۂ کار کے اختیار کرنے کا کوئی حقیقی موقع پیدا ہوجائے تو پھر جماعت کو اپنے اوپر جراحی کا عمل کرنے میں ان جذبات و حسیات کو مانع نہیں ہونے دینا چاہیئے جو ایسے حالات میں بہرحال ابھر آتے ہیں۔ تحریک کے مفاد کے لئے ان جذبات و حسیات کی قربانی دیئے بغیر ترقی کا قدم کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

خدا کے انبیا کے قائم کردہ جماعتی نظام کے درہم برہم ہوجانے کے بعد اگر اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے کوئی ایک یا چند جماعتی نظام قائم ہوں تو ان کی حیثیت یہ نہیں ہوتی کہ ایمان و اسلام صرف اُن کے دائرے کے اندر ہی پایا جائے اور جو ان کے دائرے سے باہر ہو اسے ایمان و اسلام سے محروم سمجھا جائے۔

پس غیر انبیا کی رہنمائی میں جو دینی جماعتیں برسرِ عمل آئیں، اُن سے کسی کا اخراج تکفیر کے ہم معنی نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں نظامِ اسلامی کے درہم و برہم ہوجانے کے بعد جو جماعتیں تجدیدِ دین کی کوشش کرنے لگی ہوں اُن کا منصب صرف دعوت و اصلاح ہوتا ہے، نہ کہ تکفیر۔ تکفیر تو دراصل اسلامی نظامِ حکومت کے عدیہ [illegible] کا کام ہے اور یہ ایک عدالتی کارروائی ہوتی ہے جسے اسلامی نظامِ قضا ہی سرانجام دے سکتا ہے۔

اخراج کے معنی یہ بھی نہیں ہوتے کہ ایک جماعت معصوم فرشتوں اور پاکبازوں کی جماعت ہے اور اس کے اندر انسانی فطرت (Human Nature) کے تقاضاہائے لغزش کی کوئی سمائی نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ اقدام ایک جماعت کو صرف اس لئے کرنا پڑتا ہے کہ وہ کم سے کم ایمان و اخلاق کے اُس ادنیٰ ترین معیار کو [illegible] رکھ سکے جسے قائم رکھے بغیر وہ اپنے نصب العین کے لئے کما حقہٗ جدوجہد نہیں کرسکتی۔ اس ادنیٰ ترین معیار کا تصور زمانے، ماحول اور انسانی فطرت کی عام کمزوریوں کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ہی قائم ہوتا ہے

اور خود شریعتِ اسلامی نے اپنے کم سے کم مطالبات انسانوں کے سامنے رکھتے ہوئے بشریت کے جملہ تقاضوں کو بہر حال سامنے رکھا ہے۔

پھر اخراج کے معنی دوامی انقطاعِ تعلق کے بھی نہیں ہوتے، بلکہ ایک اصلاحی جماعت کے دروازے لوٹ کر آنے والوں کے لئے کھلے رہتے ہیں۔

کسی جماعت سے علیحدگی ایک فرد کو فوراً آزمائش کے ایک دوراہے پر لا کے کھڑا کر دیتی ہے۔ اب یا تو وہ اپنے اصول و نصب العین سے حقیقی وفاداری نہ رکھنے کی صورت میں ایک جذباتی بحران کی رو میں بہنے لگتا ہے اور اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور یا پھر اگر اس کے دل میں اصول اور نصب العین کی وفاداری مستحکم ہو تو وہ از سرِ نو اپنی ذہنی و اخلاقی تعمیر کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور ایک نئے ولولۂ کار کے ساتھ پچھلی کوتاہیوں کی تلافی کا سامان کرنے میں لگ جاتا ہے۔ اگر پہلی صورت رونما ہوتی ہے تو ایک فرد اپنی نا اہلیت کو خود ہی کھول کر سامنے رکھ دیتا ہے اور اگر دوسری صورت ہو تو دستوری علیحدگی کے باوجود وہ ایک نصب العین سے جوں کا توں وابستہ رہتا ہے اور اس کے لئے بعید نہیں ہوتا کہ وہ اپنا کھویا ہوا مقام پھر حاصل کر لے یا اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ بلند سطح پہ لے جائے!

آخر میں ہم سب کو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنی چاہیئے کہ اسکی راہ میں جن لوگوں نے اب تک قدم بڑھایا ہے اُن میں سے کوئی ایک بھی قدم پیچھے ہٹانے والا ثابت نہ ہو اور وہ کبھی ایسا موقع نہ لائے کہ ہم میں سے کسی کی خدمات سے جماعت اپنے آپ کو محروم کرنے پر مجبور ہو جائے۔ وہ ہم کمزور لوگوں کے لئے خود قوت بن جائے، وہ ہمیں جذبۂ صادق عطا کرے اور ہماری سیرتوں کو اس مقصد کے مطابق بنانے میں ہماری مدد فرمائے جسے لے کر ہم جیسے ادنیٰ لوگ میدانِ عمل میں آ رہے ہیں۔

مزارعت پر تحقیقی نظر

زیر ترتیب مضمون میں مزارعت (بٹائی) سے متعلق آئمہ سلف وخلف کے مختلف نقطہائے نظر مع دلائل پوری وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ ناظرین ترجمان القرآن براہ راست کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں

زمین سے متعلق دوسرے ضروری مسائل پر کسی دوسری صحبت میں گفتگو کیجائیگی۔ انشاء اللہ

عبدالغفار حسن

ائمہ سلف وخلف کے مختلف مسالک پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان زمین کی انفرادی ملکیت کے بارے میں کوئی اختلاف[1] نہ تھا۔ اختلاف اس بات میں تھا کہ اس ملکیت کی حدود کیا ہیں اور مالکانہ حقوق کا استعمال کیسے کیا جاسکتا ہے۔

مزارعت کے حامی اور مخالف مزارعت کے بارے میں فقہاء ومحدثین کرام میں دو مسلک پائے جاتے ہیں

(۱) مزارعت (بٹائی) کی ہر صورت ناجائز ہے۔ (۲) مزارعت کی صرف وہ صورتیں ناجائز ہیں جن میں دھوکہ فریب، نزاع وجدال اور ایک فریق کے لئے نقصان اور دوسرے فریق کے لئے نفع کا قوی احتمال موجود ہو۔ ان کے علاوہ باقی شکلیں جائز ہیں۔

پہلے مسلک کے قائلین یہ حضرات ہیں۔ عکرمہ، مجاہد، نخعی، امام ابوحنیفہ رح، امام زفر، امام شافعی (ان کے نزدیک مساقاۃ[2] کے ضمن میں مزارعت جائز ہے مستقلاً علیحدہ نہیں)

---

[1] یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ حرمت مزارعت کے قائل ہونے کے باوجود کراء الارض بالذہب والورق یعنی سونے چاندی کے عوض زمین کرایہ پر دینے کو جائز قرار دیتے ہیں۔

[2] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں چند تشریح طلب اصطلاحات کی وضاحت کردی جائے۔

مساقاۃ - باغ کو سیرابی کے لئے نصف یا ثلث وغیرہ پر کسی کو دینا۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۰ پر)

اسی طرح امام مالک کے نزدیک بھی علیحدہ جائز نہیں ہے۔ ہاں باغ کے احاطہ میں ایک تہائی زمین بٹائی پر دی جاسکتی ہے۔

دوسرے مسلک کے حامیوں کی صف میں یہ مشہور اہل علم نظر آتے ہیں۔ خلفاء راشدین۔ سعد بن ابی وقاص، عبد اللہ بن عباس، سعید بن مسیب، عمر بن عبد العزیز، سفیان ثوری، اوزاعی، ابو یوسف، محمد، اسحٰق، امام احمد بن حنبل، ابن حزم، ابن تیمیہ، ابن قیم، شاہ ولی اللہ رح

حرمت مزارعت کے دلائل | پہلے گروہ کے استدلال کی بنیاد حضرت جابرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت رافع بن خدیجؓ کی روایات پر ہے۔ یہ روایتیں بخاری، مسلم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔ یہاں چند اہم اور مشہور روایات نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) عن جابر بن عبد اللہ قال: نھیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المخابرۃ والمحاقلۃ الخ صحیح بخاری مع فتح ج ۵ ص ۱۵ - صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۱

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ اور محاقلہ سے منع فرمایا ہے۔

(۲) عن جابر بن عبد اللہ قال کان لرجال فضول ارضین من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کانت لہ فضل ارض فلیزرعھا او لیمنحھا اخاہ فان ابی فلیمسک ارضہ (حوالہ مذکورہ)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ بعض صحابہ کے پاس فالتو اراضی تھیں۔ تو آپ نے فرمایا جس کے پاس فالتو زمین ہو وہ اس میں کھیتی کرے۔ یا اپنے بھائی کو ہبہ کردے اور اگر وہ انکار کرے تو پھر وہ اپنی زمین روکے رکھے۔

مزارعہ، مخابرہ | زمین کو بٹائی پر دینا۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ مزارعت میں بیج مالک زمین دیتا ہے۔ اور مخابرہ میں بیج کاشتکار کے ذمے ہوتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایک دوسرے کے ہم معنی بھی مستعمل ہو جاتے ہیں۔

محاقلہ۔ یہ لفظ روایات میں تین معانی میں مستعمل ہوا ہے (۱) کھیتی کو پکنے سے پہلے فروخت کردینا۔ (باقی صفحہ ۹۱ پر)

مذکورہ بالا روایت ۲ کے ہم معنی الفاظ حضرت ابو ہریرہ رضی کے واسطے سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔

(۳) عن نافع ان ابن عمرؓ کان یکری مزارعہ علی عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفی امارۃ ابی بکر وعمر وعثمان وصدرا من خلافۃ معاویۃ حتی بلغہ فی آخر خلافۃ معاویۃ ان رافع بن خدیج یحدث فیہا بنہی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فدخل علیہ وانا معہ فسألہ. فقال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینہی عن کراء المزارع فترکہا ابن عمرؓ بعدہٗ فکان اذا سئل عنہا بعد قال زعم ابن خدیج ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عنہا

حوالہ مذکور ص ۱۳

نافع سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے کھیت کرایہ (بٹائی) پر دیا کرتے تھے۔ (ان کا یہ عمل) عہد نبوی، حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ کے دور خلافت اور معاویہ رضی کے ابتدائی دور امارت تک جاری رہا۔ امارت معاویہ کے آخری دور میں ان کو معلوم ہوا کہ رافع بن خدیج اس بارے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت نقل کرتے ہیں۔ ابن عمر ان کے پاس پہنچے میں بھی ساتھ تھا ان سے سوال کیا، انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کراء مزارع سے روکتے تھے۔ اس کے بعد حضرت ابن عمر نے اپنا یہ عمل ترک کر دیا۔ اور جب ان سے اس بارے میں سوال کیا جاتا تو فرماتے کہ رافع ابن خدیج نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے

(۴) عن رافع بن خدیج قال کنا نحاقل الارض علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنکریہا بالثلث والربع والطعام

رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں محاقلہ یعنی زمین کو تہائی، چوتھائی یا معین کھانے کے بدلے کرایہ پر دیدیا

(۲) زمین کو بٹائی پر دینا (۳) زمین کو کرایہ، اجرت اور ٹھیکہ پر دینا

کراء الارض: یہ لفظ احادیث میں بٹائی اور ٹھیکہ دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ سیاق و سباق سے اس کا مفہوم متعین ہو سکتا ہے۔

مؤاجرہ۔ کسی شئے کو اجرت پر دینا۔ یہ لفظ بھی کراء الارض کے ہم معنی ہے۔

المسمّٰی فجاء ناذات یوم رجل من عمومتی فقال نھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن امر کان لنا نافعا وطواعیۃ اللہ ورسولہ انفع لنا نھانا ان نحاقل بالارض فنکریھا علی الثلث والربع والطعام المسمّٰی وامر رب الارض ان یزرعھا او یزرعھا وکرہ کراءھا وما سوی ذالک   صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۳

کرتے تھے ۔

ایک دن میرے چچاؤں میں سے ایک صاحب تشریف لائے اور انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایسے کام سے روک دیا ہے۔ جو ہمارے لئے نفع بخش تھا۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہمارے لئے زیادہ فائدہ مند ہے۔ آپ نے ہمیں زمین کو ثلث، ربع یا معین مقدار طعام کے عوض بٹائی پر دینے سے روکا ہے اور مالک زمین کو حکم دیا ہے کہ وہ خود کاشت کرے یا دوسرے کو کاشت کے لئے دیدے، اس کو کرایہ (بٹائی) پر دینے اور اس کے علاوہ دوسری شکلوں کو ناپسند فرمایا ہے۔

(۵) عن ابن ابی نعم قال حدثنی رافع بن خدیج انہ زرع ارضا فمر بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یسقیھا فسألہ عن الزرع ولمن الارض فقال زرعی ببذری وعملی لی الشطر ولبنی فلان الشطر فقال اربیتما فرد الارض علی اھلھا وخذ نفقتک ۔

طحاوی ج ۲ ص ۲۵۶ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۲۷ باب المزارعۃ

ابن ابی نعم سے روایت ہے کہ مجھ سے رافع بن خدیج نے بیان کیا کہ انھوں نے ایک زمین بیجی ایک دن جبکہ وہ اسے سیراب کر رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گذرے اور آپ نے دریافت فرمایا کھیتی کس کی ہے اور زمین کس کی؟ میں نے کہا کھیتی میرے بیج اور عمل کے عوض سے میرا آدھا حصہ ہے۔ اور فلاں شخص کی اولاد کا نصف حصہ ہے۔ آپ نے فرمایا تم سود میں مبتلا ہو گئے زمین اصلی مالک کی طرف واپس کردو۔ اور اپنا خرچ لے لو۔

(۶) عن جابرؓ قال سمعت رسول اللہ

حضرت جابر سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں

صلی اللہ علیہ وسلم یقول من لم یذر المخابرۃ فلیؤذن بحرب من اللہ عز وجل ۔

طحاوی ج ۲ ص ۲۵۰ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۲۰ باب المخابرۃ

میں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے مخابرہ کو ترک نہیں کیا وہ اللہ سے اعلان جنگ کر دے ۔

(۷) عن رافع بن خدیج ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مر بحائط فاعجبہ فقال لمن ھذا فقلت لہ استاجرتہ ۔ فقال لا تستأجرہ بشیء ۔

المبسوط علامہ سرخسی ج ۲۳ ص ۱۱

رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک باغ سے گذر ہوا، آپ کو وہ پسند آیا ۔ آپ نے دریافت کیا کہ یہ باغ کس کا ہے ۔ میں نے کہا، اس کو میں نے اجرت (کرایہ یا بٹائی) پر لیا ہے، آپ نے فرمایا کسی شے کے بدلہ پر بھی اس کو اجرت پر مت لو ۔

(۸) وعنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن کراء المزارع فقلت انا نکریھا بما علی الربیع الساقی، فقال لا فقلت انا نکریھا بالتبن فقال لا، فقلت انا نکریھا بالثلث والربع فقال لا ازرعھا او امنحھا اخاک ۔ مبسوط حوالہ مذکور

رافع سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو کرائے (بٹائی) پر دینے سے منع فرمایا ہے ۔ میں نے کہا ہم اس پیداوار کے بدلے بٹائی پر دیتے ہیں جو نالے یا نہر کے کنارے ہوتی ہے ۔ آپ نے فرمایا جائز نہیں ۔ میں نے کہا ہم بھوسے کے بدلے بٹائی پر دیتے ہیں ۔ آپ نے کہا نہیں ۔ میں نے کہا ہم تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض بٹائی پر دیتے ہیں ۔ آپ نے فرمایا نہیں ۔ خود کھیتی کرو ۔ یا اپنے بھائی کو ہبہ کر دو ۔

(۹) عن رافع ان اسید بن ظھیر جاء ذات یوم الی قومہ ۔ فقال یا بنی خارجۃ قد دخلت علیکم الیوم مصیبۃ قالوا

رافع سے روایت ہے کہ اسید بن ظہیر ایک دن اپنی قوم کے پاس آئے، انہوں نے کہا اے بنی خارجہ آج تم پر ایک مصیبت آن پڑی ہے

ماھی ؟ قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کراء الارض، قلنا یا رسول اللہ انا نکریھا بما یکون علی الربیع الساقی من الارض فقال ازرعھا او امنحھا اخاک،

مبسوط ج ۲۳ صفحہ ۱۲

لوگوں نے کہا وہ کیا ؟ اسید نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کراء الارض سے منع کر دیا ہے ہم نے کہا اے اللہ کے رسول ہم نالے ندی والی زمین کی پیداوار کے بدلے معاملہ کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا خود کاشت کرو یا اپنے بھائی کو دیدو۔

علامہ سرخسی لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے امام ابوحنیفہ کے مسلک کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ربیع ساقی" والی صرف مخصوص صورت ہی سے اگر روکا تھا تو اسے مصیبت کہنے اور اس پر ہراساں ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ ان کے لئے مزارعت کی دوسری راہ ثلث ربع والی کھلی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان پر مزارعت کی تمام راہیں بند کردی تھیں جیسا کہ حدیث نمبر ۸ سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس روایت (نمبر ۸) کی صحت پر تمام اہل علم متفق نہیں ہیں"۔ انتھی ملخصًا

حدیث خیبر کا جواب عام طور پر مزارعت کے جواز میں یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو خیبر کی زمین بٹائی پر دی تھی۔ حالانکہ وہاں مزارعت کی شکل نہ تھی بلکہ وہ جزیہ تھا جو خیبر کی پیداوار پر یہود سے وصول کیا جاتا تھا۔ اگر یہ مزارعت تھی تو معاہدہ میں اس کی مدت کا تعین ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ واقعتًہ ایسا نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ رح نے حدیث خیبر کی یہی توجیہ کی ہے۔ امام سرخسی رح نے اسے خراج مقاسمہ سے تعبیر کیا ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من علیھم بدمائھم واراضیھم ونخیلھم وجعل شطر الخارج علیھم بمنزلۃ خراج المقاسمۃ وللامام رأی فی الارض الممنون بھا علی اھلھا ان شاء جعل علیھا خراج

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جانوں، زمینوں اور نخلستانوں کو آزاد اور کھلا رکھتے ہوئے ان پر احسان فرمایا۔ اور ان پر پیداوار کا نصف حصہ بطور خراج مقاسمہ مقرر کردیا۔ اور یہ امر امام کی صواب دید پر منحصر ہے کہ وہ زمین بطور احسان مفتوح قوم کے

المقاسمۃ ۔ المبسوط ج ۲۳ صفہ ۳ | قبضہ میں چھوڑ دے ۔ اس پر وہ خراج[1] مقاسمہ لازم کردے یا خراج وظیفہ ۔

مضاربت اور مزارعت کے درمیان فرق | بعض اہل علم نے مضاربت پر قیاس کرتے ہوئے مزارعت کو بھی جائز ٹھہرایا ہے ۔ لیکن مخالفین مزارعت کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ مضاربت پر قیاس، قیاس مع الفارق ہے ۔

مضاربت میں اگر نقصان ہوتا ہے تو اس کا خمیازہ مالکِ سرمایہ اور صاحبِ محنت دونوں کو بھگتنا پڑتا ہے ۔ لیکن مزارعت کی صورت میں اگر نقصان ہو تو مزارع کی محنت برباد ہوتی ہے ۔ لیکن زمین اپنی جگہ محفوظ رہتی ہے ۔ مالک زمین کو کسی قسم کا نقصان نہیں برداشت کرنا پڑتا ۔ وہ صرف پیداوار کے منافع سے محروم ہو جاتا ہے ۔

قرآن سے استدلال | زمانۂ حال کے بعض اہل علم نے مزارعت کی حرمت پر مندرجہ ذیل آیات کے عموم و اطلاق سے بھی استدلال کیا ہے ۔

للرجال نصیب مما اکتسبوا و للنساء نصیب مما اکتسبن ۔	مردوں کے لئے حصّہ ہے اس مال میں سے جو انھوں نے کسب کیا ۔ اور عورتوں کے لئے حصّہ ہے اس مال میں سے جو انھوں نے کمایا ۔
لیس للانسان الا ما سعیٰ پ ۲۷ سورہ والنجم	انسان کے لئے نہیں ہے مگر وہی کچھ جو اس نے محنت و کوشش سے حاصل کیا ۔

یعنی انسان جو شے اپنے کسب ، محنت اور سعی سے حاصل کرے اسی پر مالکانہ تصرف کا حق رکھتا ہے ۔ اس کے علاوہ کسی دوسری صورت میں وہ اس شے کے مالک کہلانے کا مستحق نہ ہوگا ۔

قائلین مزارعت کے دلائل | جو اہل علم مزارعت کی تمام شکلوں کو حرام قرار نہیں دیتے ان کے استدلال

---

[1] خراج مقاسمہ ، یعنی خراج کی وہ صورت جس میں پیداوار کا نصف یا ثلث حصّہ ادا کرنا طے ہو ۔ خراج وظیفہ یعنی پیداوار کی متعین مقدار جو بطور خراج ادا کی جائے ۔

کی بنیاد مندرجہ ذیل آثار و سنن پہ ہے۔

(۱) عن ابن عمرؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عامل اہل خیبر بشطر ما یخرج من ثمر او زرع۔ صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۱۴ ۔ صحیح بخاری مع فتح الباری مصری ج ۵ صفحہ ۹

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والوں سے غلہ پھل کی نصف پیداوار پر معاملہ کیا۔

اس حدیث کو جزیہ یا خراج مقاسمہ پر محمول کرنا درست نہیں ہے کیونکہ خیبر کا یہ واقعہ ۷ھ میں پیش آیا۔ اور جزیہ کا حکم اس کے دو سال بعد ۹ھ میں نازل ہوا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۳۴۶) حافظ ابن قیم رحمہ لکھتے ہیں۔

انہ لم یاخذ من احد من الکفار جزیۃ الا بعد نزول براءۃ فی السنۃ الثامنۃ من الھجرۃ۔ زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۳۳

سورہ توبہ کے ۸ھ میں نازل ہو جانے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے جزیہ نہیں وصول کیا (واضح رہے کہ جزیہ کا حکم سورہ توبہ ہی میں ملتا ہے۔

اسی طرح خراج مقاسمہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ عرب کی تمام زمین عشری ہے خراجی نہیں۔ ہدایہ کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ ان ارض العرب کلہا ارض عشر (ہدایہ مع فتح القدیر ج ۴ صفحہ ۳۵۸) باقی رہا مدت کے عدم تعین کا سوال تو اس سے مزارعت کے جواز میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ یہ شرط تو وہاں ضروری ہے جہاں مدت کے عدم تعین سے نزاع اور جھگڑے کا اندیشہ ہو۔ لیکن یہاں صورت حال اس طرح نہیں ہے۔ اس واقعہ میں نقرکم ما اقرکم اللہ (ہم تم کو ٹھرائیں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ٹھرانے کا حکم ہوگا) کہدینا ہی کافی سمجھا گیا ہے۔

تیسرا شبہ | ایک شبہ یہاں یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ اسلامی ریاست کی زمین حکومت کی طرف سے بٹائی پر دیجائے۔ اور افراد، مزارعت پر زمین دیں۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ حدیث سے اول الذکر صورت کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن یہاں مابہ النزاع اور ثبوت طلب شے دوسری شکل ہے لیکن

یہ شبہ اس صورت میں درست ہو سکتا ہے جبکہ خیبر کی تمام زمین ریاست کی متصور کر لی جائے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ خیبر کا اکثر حصہ لڑائی سے فتح ہوا۔ اور اس کی زمین مجاہدین اور مستحقین میں تقسیم کی گئی۔ اور انفرادی ملکیت کی حیثیت سے مزارعت کا معاملہ حکومت کے انتظام کے ماتحت طے پایا۔ اس تفصیل کی تائید مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے۔

قال عمر رض لولا آخر المسلمين ما فتحت قرية الا قسمتها بين اهلها كما قسم النبي صلى الله عليه وسلم خيبر۔
بخاری مع فتح الباری مصری ج ۵ ص ۱۳

(فتح شام کے موقعہ پر حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر بعد میں آنے والے مسلمانوں کی محرومی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں شام کی مفتوحہ زمین کو تقسیم کر دیتا جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو تقسیم کیا تھا۔

ازواج مطہرات کے حصہ کی زمین حضرت عمرؓ کے زمانہ تک حکومت کی نگرانی میں رہی۔ اور ان کو حصہ رسدی کے مطابق غلہ اور کھجوریں ملتی رہیں۔ لیکن جب یہود خیبر کو جلاوطن کر دیا گیا تو حضرت عمرؓ نے ازواج مطہرات کو اختیار دیدیا کہ خواہ وہ حسب معمول پیداوار لیتی رہیں یا زمین کو بھی اپنی نگرانی میں لے لیں۔ حضرت عائشہؓ نے دوسری صورت کو پسند فرمایا۔ بخاری ج ۵ ص ۹

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ خیبر کی تقسیم عہد نبوی میں ہی ہو گئی تھی۔ لیکن انتظام حکومت کے ہاتھ میں رہا۔ لیکن دور فاروقی میں یہ پابندی بھی باقی نہ رہی۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۱۵

(۲) عن ابی هريرة رض قال قالت الانصار للنبي صلى الله عليه وسلم اقسم بيننا وبين اخواننا النخيل قال لا، فقالوا تكفونا المؤنة ونشرككم في الثمرة قالوا سمعنا واطعنا۔ بخاری مع فتح مصری ج ۵ ص ۶

حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ انصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے اور بھائی (مہاجرین) کے درمیان نخلستان تقسیم کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر انصار نے کہا۔ بجائے ہمارے محنت و مشقت کا کام آپ لوگ سنبھال لیں۔ اور ہم آپ کو پھلوں میں شریک کریں گے۔

یعنی نخلستان انصار کے تھے۔ اور مہاجرین کے ذمے ان کی

سیرابی اور آبپاشی کا کام لگا یا گیا۔ اور اس طرح وہ پیدا وار میں انصار کے شریک ہو گئے۔

اس روایت سے بظاہر مساقاۃ کا ثبوت ملتا ہے لیکن نتیجۃً مساقاۃ اور مزارعت میں کوئی فرق نہیں ہے اگر مساقاۃ جائز ہے تو مزارعت کے جواز میں شک کیسے ہو سکتا ہے

(۳) عن ابی جعفر قال ما بالمدینۃ اہل بیت ہجرۃ الا یزرعون علی الثلث والربع

ابو جعفر سے روایت ہے کہ مدینہ میں کوئی ایسا مہاجر گھر نہ تھا جو تہائی یا چوتھائی پہ کاشت نہ کرتا ہو یعنی مدینہ میں مزارعت کا عام رواج تھا۔ اور اس میں کسی قسم کی قباحت محسوس نہ کیجاتی تھی۔

(۴) آثار صحابہ۔ (الف) زارع علیؓ وسعد بن ابی وقاص وعبد اللہ ابن مسعود وعمر بن عبد العزیز والقاسم وعروۃ بن الزبیر وآل ابی بکر وآل عمر وآل علی وابن سیرین

بخاری مع فتح ج ۵ صہ

حضرت علی، سعد بن ابی وقاص، عبد اللہ بن مسعود، عمر بن عبد العزیز (تابعی) قاسم (تابعی) عروۃ بن زبیر آل ابوبکر، آل عمر، آل علی اور ابن سیرین تابعی سب نے عملاً مزارعت میں حصہ لیا۔

ان آثار کی تفصیلات فتح الباری ج ۵ اور عینی ج ۱۱ صہ ۱۶۵ میں ملتی ہیں۔

(ب) وعامل عمر الناس علی ان جاء عمر بالبذر من عندہ فلہ الشطر وان جاؤا بالبذر فلھم کذا

بخاری مع فتح ج ۵ صہ

حضرت عمرؓ نے لوگوں سے معاملہ کیا کہ اگر وہ بیج اپنے پاس سے دیں تو ان کا نصف حصہ ہے اور اگر مزارعین بیج کے خود ذمہ دار ہوں تو ان کا اتنا اور اتنا حصہ ہے۔

(ج) عن طاؤس قال قدم علینا معاذ بن جبل فاعطی الارض علی الثلث والربع فنحن نعملھا الی الیوم۔ قال ابن حزم ومات

طاؤس تابعی سے روایت ہے کہ حضرت معاذ ہمارے پاس تشریف لائے اور انھوں نے تہائی اور چوتھائی پہ زمین دی۔ اور ہم اب تک اس پر عمل کر رہے ہیں۔ علامہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومعاذ علیٰ هذا العمل فی الیمن۔ محلی ابن حزم ج ۸ ص ۲۱۱

ابن حزم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی درانحالیکہ معاذ رضؓ یمن میں یہ عمل (مزارعت) کرتے تھے۔

مذکورہ بالا صحابہ کرام کے علاوہ اور دوسرے جلیل القدر صحابہ کے نام بھی ملتے ہیں۔ جنہوں نے بٹائی پر زمین دی۔ حضرت ابوبکرؓ، عثمانؓ، خبابؓ، حذیفہؓ۔ ان سب حضرات کے آثار پوری تفصیل کے ساتھ علامہ ابن حزم نے محلیٰ ج ۸ میں نقل کئے ہیں۔ ان اصحاب کرام کا یہ طرز عمل تمام صحابہ کے سامنے تھا لیکن کسی کی طرف سے کوئی اعتراض یا انکار نہیں ملتا۔ باقی رہا اس بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر اور رافع بن خدیج کا مکالمہ تو اس کی تفصیل آئندہ بیان ہوگی۔

ممانعتِ مزارعت والی روایات کا صحیح منشا اہل علم کا وہ گروہ جو مزارعت کو بالکلیہ حرام قرار نہیں دیتا، احادیث حرمت کی توجیہ وتشریح چار طرح پر کرتا ہے۔

(۱) حضرت جابر و ابوہریرہؓ کی روایات میں مزارعت کو حرام نہیں قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ دراصل ایک اخلاقی فضیلت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے یعنی اپنے مسلمان بھائی کو زمین بٹائی پر دینے کے بجائے اسے ہبہ کر دینا افضل اور بہتر ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس کی تصریح سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

قال ابن عباس رضؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم ینہ عنہ، ولکن قال ان یمنح احدکم اخاہ خیر لہ من ان یاخذ شیئا معلوما بخاری مع فتح ج ۵ ص ۱۰ صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۴

حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس (مزارعت) سے روکا نہیں ہے بلکہ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا اپنے بھائی کو زمین ہبہ کر دینا اس سے بہتر ہے کہ اپنے بھائی سے (پیداوار میں سے) کچھ معاضہ لو۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ طاؤس کہتے ہیں کہ اس مسئلہ مزارعت کے بارے میں سب سے زیادہ باخبر شخصیت حضرت عبداللہ بن عباس ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس سے منع نہیں فرمایا۔ بلکہ صرف افضل کام کی طرف رغبت دلائی ہے۔ انتہی مخلصاً، ص۱۲۔

دوسری روایت میں ہے:

عن ابن عباس رض ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یحرم المزارعۃ ولکن امران یرفق بعضہم ببعض۔ ترمذی نیل الاوطار ج ۵ ص۱۵۳

ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت کو حرام نہیں قرار دیا بلکہ اس بات کا حکم دیا کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کے منشا متعین کرنے میں جو وزن اجلہ صحابہ کی تشریح و تفسیر کو حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ بعد کے اہل علم کو نہیں دیا جا سکتا۔

(۲) رافع بن خدیج کی روایت میں جس مزارعت کی ممانعت آئی ہے اس سے ایک متعین شکل مراد ہے اس کے علاوہ دوسری صورتیں جائز ہیں۔

اس کی تائید حضرت رافع بن خدیج ہی کی اس تشریح سے ہوتی ہے۔

عن حنظلۃ بن قیس الانصاری قال سألت رافع بن خدیج عن کراء الارض بالذهب والورق فقال لا بأس به۔ انما کان الناس یؤاجرون علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الماذیانات واقبال الجداول واشیاء من الزرع فیہلک هذا ویسلم هذا ویسلم هذا ویہلک هذا فلم یکن للناس کراء الا هذا فلذلک زجر عنہ۔ واما شیء معلوم مضمون فلا بأس به۔

صحیح مسلم ج ۲ ص۱۳

حنظلہ بن قیس انصاری سے روایت ہے کہ میں نے رافع بن خدیج سے سونے چاندی کے بدلے زمین کرایہ پر دینے کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لوگ صرف نالے ندی کے کنارے والی زمین اور غیر معین پیداوار پر معاملہ کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کبھی زمین کا یہ حصہ محفوظ رہتا اور دوسرا برباد ہو جاتا۔ اور کبھی اس کے برعکس ہوتا۔

اس وقت زمین کو کرایہ (بٹائی) پر دینے کی صرف یہی صورت تھی۔ اس لئے آپ نے اس سے منع فرمایا لیکن اگر متعین مقدار ہو، اور کسی ایک فریق کے لئے نقصان کا

اندیشہ نہ ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس روایت سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں (۱) عہد نبوی میں مزارعت کی ایک خاص شکل رائج تھی۔ یعنی مالک زمین کسی متعین زمین کے ٹکڑے کو اپنے لئے خاص کر لیتا کہ اس کی پیداوار میں لوںگا باقی حصہ مزارع کا ہوگا۔ اس طرح بعض دفعہ مالک زمین کے ٹکڑے میں خوب پیداوار ہوتی اور کاشتکار کی زمین میں پیداوار کم یا بالکل نہیں ہوتی۔ اور کبھی اس کے برعکس نتیجہ نکلتا۔ اسی کو آپ نے منع فرمایا تاکہ صرف ایک ہی فریق کے حصے میں گھاٹا نہ آئے۔ اور کسی نزاع اور فساد کی صورت نہ پیدا ہو۔ لیکن اگر زمین کے قطعات متعین کرنے کے بجائے پیداوار کی مقدار مثلاً نصف یا ثلث متعین کر لی جائے تو نفع نقصان دونوں صورتوں میں فریقین یکساں رہتے ہیں۔ اور کسی نزاع و جدال کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔

(۲) فلم یکن کراء الا ھذا۔ اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر مزارعت کی مذکورہ بالا ہی صورت پر لوگ عمل کرتے تھے۔ لہٰذا جن روایات میں عام ممانعت آئی ہے اُن سے بھی یہی خاص شکل مراد ہوگی۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ رافع بن خدیج کی بعض روایات میں ثلث و ربع کی تصریح کے ساتھ ممانعت آئی ہے۔ لیکن اس بارے میں صحیح اصول یہ ہے کہ کسی مسئلہ کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے محض دو تین احادیث پر ہی اعتماد کر لینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس باب سے متعلق تمام روایات کے مجموعے پر یکجائی غور و فکر کے بعد ہی نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ربع یا ثلث پر زمین دینے کی ممانعت بھی مطلقاً نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ایک خاص قسم کی صورت کو روکنا مقصود ہے۔ ذیل کی روایات میں اس خاص صورت کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

(الف) قال جابر بن عبد اللہ یقول کنا فی زمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نأخذ الارض بالثلث والربع بالماذیانات فقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذالک فقال من کانت لہ ارض فلیزرعھا فان لم	حضرت جابر کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ندی نالے کے قریب کی زمین تہائی یا چوتھائی پر لیا کرتے تھے۔ تو اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو اس میں خود کاشت کرے۔ ورنہ اپنے بھائی

یزرعھا فلیمنحھا اخاہ۔ مسلم ج ۲ ص ۱۲

کو عطا کر دے۔

(ب) عن رافع رض قال کنا اکثر اھل المدینۃ حقلا وکان احدنا یکری ارضہ۔ فیقول ھذہ القطعۃ لی وھذہ لک ربما اخرجت ذہ ولم تخرج ذہ فنھاھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ بخاری مع عینی ج ۲۱ ص ۱۷۰

رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ ہم مدینہ میں سب سے زیادہ کھیتوں کے مالک تھے۔ ہم میں سے ایک شخص اپنی زمین کرایہ پر دیتے وقت یہ کہا کرتا کہ زمین کا یہ ٹکڑا میرے لئے ہے۔ اور یہ تمہارا ہے۔ تو بسا اوقات ایسا ہوتا کہ ایک میں تو پیداوار ہوتی اور دوسرا خالی رہ جاتا۔ نبی صلعم نے ہمیں اس سے منع فرمایا۔

(ج) عن نافع ان ابن عمر کان یکری مزارعہ علی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر و عمر و عثمان وصدرا من امارۃ معاویۃ۔ ثم حدث عن رافع بن خدیج ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن کراء المزارع فذھب ابن عمر الی رافع فذھبت معہ۔ فسأل۔ فقال نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن کراء المزارع فقال ابن عمر قد علمت انا کنا نکری مزارعنا علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بما علی الاربعاء وبشیٔ من التبن

بخاری مع عینی ج ۱۲ ص ۱۸۳

نافع رح سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رض اپنے کھیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر رض، عمر رض، عثمان رض اور معاویہ رض کے ابتدائی دور امارت میں بٹائی پہ دیا کرتے تھے۔ پھر حضرت عبداللہ بن عمر کو بتایا گیا کہ رافع بن خدیج روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین بٹائی پہ دینے سے منع فرمایا ہے۔ تو ابن عمر رض رافع خدیج رض کے پاس گئے۔ میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ تو انھوں نے (اس بارے میں) سوال کیا۔ رافع بن خدیج نے کہا (ہاں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین بٹائی پہ دینے سے روکا ہے۔ تو اس کے جواب میں ابن عمر نے فرمایا" آپ جانتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہروں سے قریب زمین کی پیداوار یا غیر معین مقدار بھوسے کے بدلے کھیت بٹائی پہ دیا کرتے تھے۔

ان روایات پر مجموعی انداز میں نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ رافع بن خدیج اور

عبداللہ بن عمر کی روایات میں مزارعت کی چند خاص شکلوں سے روکا گیا ہے۔ کوئی عام ممانعت نہیں کی گئی ہے۔

علامہ عینی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "امام طحاوی کی مندرجہ ذیل روایت سے مذکورہ بالا حدیث کا منشا اور بھی زیادہ واضح ہوجاتا ہے"۔

(د) عن نافع ان رافع بن خدیج اخبر عبد اللہ بن عمر ان عمومتہ جاؤا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم رجعوا فقالوا اِنَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن کراء المزارع فقال ابن عمر رض فقد علمنا انہ کان صاحب مزرعۃ یکریھا علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ان لہ ما فی ربیع الساقی الذی تفجر منہ الماء وطائفۃ من التبن ولا ادری ما ھو

(حوالہ مذکور)

نافع سے روایت ہے کہ رافع بن خدیج نے حضرت عبداللہ بن عمر رض کو بتلایا کہ ان کے چچا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے پھر (اپنے گھروں کو) پلٹ گئے اور انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو بٹائی پر دینے سے منع کیا ہے۔ (اس پر) عبداللہ بن عمر رض نے فرمایا کہ ہمیں معلوم ہے کہ رافع بن خدیج کے پاس زمین تھی جسے وہ عہد نبوی میں اس شرط پر بطور مزارعت دیا کرتے تھے کہ زمین کے اس حصہ کی پیداوار جہاں سے پانی کا چشمہ بہتا ہے میری ہوگی۔ اور (اسی طرح) اس بھوسے کے عوض جس کی مقدار کا علم نہیں، وہ معاملہ کرلیا کرتے تھے۔

"اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ عبداللہ بن عمر رض، رافع بن خدیج کو علی الاطلاق کراء الارض کی ممانعت بیان کرنے پر ٹوک رہے ہیں۔ اور بتلا رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عقد مزارعت سے منع کیا ہے (وہ عام نہیں ہے) بلکہ اس سے وہ شکل مراد ہے جس میں کوئی فاسد (غیر شرعی) شرط کا اضافہ کردیا گیا ہو، یا معاوضہ کا معاملہ غیر معین اور مجہول ہو۔ اس طرح نزاع پیدا ہوسکتا ہے۔ اور مالک زمین یا مزارع دونوں میں سے کوئی گھاٹے اور نقصان میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ لیکن ثلث، ربع وغیرہ

کے عوض زمین بٹائی پر دینا تو اس کی ممانعت ثابت نہیں ہے" عینی شرح بخاری ج ۱۲ ص ۱۰۳ ؎

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رافع بن خدیج رض کے بیان پر حضرت عبد اللہ بن عمر رض نے مزارعت کو علی الاطلاق اس اندیشہ سے چھوڑ دیا تھا کہ ہو سکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسا حکم دیا ہو جس کا انہیں علم نہ ہو سکا ۔ تو یہ ترک و اجتناب درحقیقت زہد و ورع اور احتیاط کی بناء پر تھا نہ کہ اس بنیاد پر کہ وہ بالکلیہ مزارعت کی حرمت کے قائل تھے ۔ علامہ سرخسی لکھتے ہیں کہ "حضرت ابن عمر رض کا یہ کہنا کہ ترکنا من اجل قولہ (رافع کے قول یعنی روایت کی وجہ سے ہم نے کراء الارض کو ترک کر دیا ہے) اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کا ترک محض زہد کی بناء پر تھا ۔ ورنہ اعتقاداً وہ اس کو جائز مانتے تھے ۔ کتنی حلال چیزیں ہیں جن کو انسان محض زہد و احتیاط کی بناء پر ترک کر دیتا ہے" المبسوط ج ۲۳ ص ۱۳ یعنی اس ترک و اجتناب کی حیثیت قانونی نہ تھی ۔ زیادہ سے زیادہ اسے اخلاقی فضیلت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(۷) عن اسید بن ظهیر قال کان احدنا اذا استغنی عن ارضه او افتقر الیها اعطاها بالنصف والثلث والربع ویشترط ثلاث جداول، والقصارة ومایسقی الربیع وکان یعمل فیها عملاً شدیداً ویصیب منها منفعة فاتانا رافع بن خدیج فقال نهی النبی صلی الله علیه وسلم عن امر کان لکم نافعاً وطاعة رسول الله صلی الله علیه وسلم خیر لکم نهاکم عن الحقل (مسند احمد، ابن ماجه) منتقی الاخبار مع نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۵۲

اسید بن ظہیر سے روایت ہے کہ ہم میں سے کوئی جب اپنی زمین سے بے نیاز ہو جاتا یا اُسے زمین (کی آمدنی) کی ضرورت ہوتی تو اسے نصف، ثلث یا ربع پر کسی کے حوالے کر دیتا ۔ اور تین شرطیں طے کر لیتا (۱) جداول یعنی ندی نالے کے کنارے زمین کی پیداوار مالک زمین کی ہوگی (۲) جس حصے کو نہر سیراب کرے اس کی پیداوار بھی مالک کی ہوگی ۔ (۳) غلہ بھوسہ بھی صاحب ارض ہی کو ملیگا ۔ اس طرح اس زمین میں خوب محنت کی جاتی اور خوب منافع حاصل ہوتے، تو (ایک دن) رافع بن خدیج آئے اور انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں ایسے کام

سے روک دیا ہے۔ جو تمہارے لئے نفع بخش تھا اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت تمہارے لئے
بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو حقل یعنی
مزارعت سے روکا ہے۔

اس روایت میں سید بن ظہیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ثلث، ربع پر زمین دینا اس صورت میں منع تھا جبکہ اس کے ساتھ فاسد شرائط کا اضافہ کر لیا جائے۔ اور عرب میں اس کا عام رواج تھا مطلقاً ممانعت بہرحال ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ مذکورہ بالا روایات سے حدیث مذکور کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔

(۳) (الف) رافع بن خدیج کی روایات میں سند اور متن دونوں اعتبار سے اضطراب اور اختلاف پایا جاتا ہے۔

اس کی تفصیل علامہ ابن قدامہ مقدسی حنبلی کی زبانی درج ذیل ہے۔

امام احمدؒ کہتے ہیں "حدیث رافع الوان و ضروب" یعنی رافع بن خدیج کی روایت نوع بہ نوع اور رنگ برنگ شکلوں میں نظر آتی ہے۔

کبھی کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے بعض چچاؤں نے روایت کی" کبھی کہتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا" اور کبھی بیان کرتے ہیں" مجھے ظہیر[۱] بن رافع نے خبر دی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس حدیث کے ظاہری مطلب سے فقہاء صحابہ میں سے دو فقیہہ صحابی عبد اللہ ابن عباس رض اور زید بن ثابت متفق نہیں ہیں۔ (ابن عباس رض کی تشریح پہلے گزر چکی ہے) حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں۔

---

[۱] صحیح مسلم میں اس بات کی تصریح ہے کہ ظہیر، رافع بن خدیج کے چچا کا نام ہے۔ لہذا البعض عمومتی، (بعض چچاؤں والی روایت اور مذکورہ بالا روایت میں کوئی اختلاف نہ رہا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ رافع بن خدیج نے کسی موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست سنا ہو، اور کبھی کسی موقعہ پر ان کے چچا ظہیر نے اور کبھی ان کے دو چچاؤں نے جیسا کہ بعض روایات میں اس کی تصریح ہے، بیان کیا ہو۔ اس قسم کے اختلاف کو اضطراب سے تعبیر کرنا محل نظر ہے

انا اعلم بذالک منہ وانما سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجلین قد اقتتلا فقال ان کان ھذا شأنکم فلا تکروا المزارع فسمع قولہ فلا تکروا المزارع۔ ابوداؤد

میں اس معاملہ سے رافع بن خدیج کی نسبت زیادہ باخبر ہوں، (اصل واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کو لڑتے جھگڑتے سنا تو آپ نے فرمایا اگر تمہارا یہی حال ہے تو پھر زمین کرائے پر مت دو تو انھوں نے اتنا سن لیا کہ کھیت کرائے پر مت دو۔

یعنی آپ کے اس ارشاد فلا تکروا المزارع کا پس منظر ان کے علم میں نہ آیا تھا۔ انھوں نے صرف آخری الفاظ سن کر یہ نتیجہ نکال لیا کہ آپ نے ہر قسم کے کراء الارض سے منع فرمایا ہے۔ حالانکہ واقعۃً ایسا نہیں ہے۔ متن حدیث میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا اندازہ ذیل کی مثال سے ہو سکتا ہے۔

رافع بن خدیج کا ایک بیان تو یہ ہے کہ فاما الورق فلم ینھنا عنہ یعنی چاندی کے ذریعہ معاملہ کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت نہیں فرمائی ہے۔ ان کا دوسرا بیان ہے فاما الذھب والورق فلم یکن یومئذ، لیکن سونا، چاندی کے عوض معاملہ کرنا تو یہ اس وقت رائج ہی نہ تھا۔ یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ جب ایک شئ کا وجود ہی اس وقت نہ تھا تو پھر یہ کہنے سے کیا حاصل کہ آپ نے اس سے روکا نہیں[1]۔

(ب) حدیث ۔ جس میں کہ مزارعت کو سودی کاروبار کے ہم پلہ ٹھہرایا ہے۔ وہ سنداً ضعیف ہے اس حدیث کا ایک راوی بکر بن عامر البجلی محدثین کے نزدیک قابل اعتماد نہیں ہے۔ نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۵۱

(۴) ممانعت والی احادیث میں مدنی زندگی کے ابتدائی مراحل کے مطابق حکم دیا گیا ہے جبکہ مہاجرین نہایت عسرت اور تنگی کی زندگی گذار رہے تھے۔ لیکن جب اس قسم کے حالات باقی نہ رہے تو یہ پابندی

---

[1] متن کا یہ اختلاف بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کی بناء پر اس روایت کو ناقابل قبول سمجھا جائے۔ قاضی شوکانی رح لکھتے ہیں۔ "ان دونوں روائتوں میں کوئی منافات اور تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ رافع کا یہ قول "فلم ینھنا" ہم کو اس سے روکا نہیں"، سے یہ لازم نہیں آتا کہ سونے چاندی کے عوض زمین کا ٹھیکے پر دینا اس وقت رائج تھا" یہ نکتہ اہل علم کے لئے قابل غور ہے۔ نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۴۹

بھی اٹھالی گئی۔

اس بارے میں قربانی کے گوشت کا معاملہ بطور نظیر پیش کیا جاسکتا ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے گوشت کو سوکھا کر ذخیرہ بنانے سے منع فرمایا تھا۔ تاکہ قربانی کے زمانہ میں امیر و غریب سب گوشت سے فائدہ اٹھاسکیں۔ لیکن جب مسلمانوں کو بجائے تنگی اور عسرت کے خوش حالی اور فارغ البالی میسر آگئی تو آپ نے گوشت کی ذخیرہ اندوزی کی اجازت دیدی[1]۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (سبل السلام مصری شرح بلوغ المرام ج ۴ صفحہ ۱۰۲)

صاحب سبل السلام کے طرز استدلال سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ممانعت مزارعت والی روایات ہمیشہ کے لئے منسوخ نہیں ہیں۔ بلکہ آئندہ بھی عسرت کے حالات اگر رونما ہوں تو اسلامی حکومت عارضی طور پر معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کے لئے اس قسم کی پابندی عائد کرسکتی ہے۔

اسی قسم کا طرز عمل مزارعت کی مختلف احادیث میں تطبیق دینے کے لئے حافظ ابن حزم نے بھی اختیار کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

زمین کو نصف، ثلث یا ربع پیداوار کے بدلے بٹائی پر دینا حدیث خیبر سے ثابت ہے، یہ آپ کا آخری عمل تھا۔ جو وفات تک جاری رہا۔ اور آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور تمام صحابہؓ نے اس پر عمل درآمد کیا، لہٰذا آپ کا یہ آخری فعل ان تمام احادیث کے اس حصے کا ناسخ ہوگا۔ جس میں مزارعت کی مطلق ممانعت آئی ہے۔ باقی رہا انہی روایات میں سے بعض میں زمین کو ٹھیکہ پر دینے سے منع کیا گیا ہے تو یہ ممانعت علی حالہ قائم رہیگی۔ کیونکہ اس کا ناسخ کوئی حکم یا عمل نہیں ملتا۔"

انتہیٰ ملخصاً۔ محلی ج ۸ صفحہ ۲۱۴

مزارعت اور مضاربت میں مماثلت مزارعت کے مخالفین میں سے کوئی بھی صاحب علم ایسا نہیں ہے جو مضاربت کے جواز کا قائل نہ ہو۔ باقی رہا یہ فرق کرنا کہ مضاربت میں فریقین نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور مزارعت میں پیداوار نہ ہونے کی صورت میں بھی زمین محفوظ رہتی ہے۔ اور کاشتکار

[1] مختلف احادیث کے درمیان تطبیق کی یہ شکل بھی بے بنیاد نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن یہاں محل نظر امر یہ ہے

باقی صفحہ یہ

کی محنت ضائع ہو جاتی ہے، درست نہیں ہے۔ مضاربت میں بھی بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مالک مال کا اصل سرمایہ محفوظ رہجاتا ہے۔ اور کاروبار میں نفع نہ ہونے کی وجہ سے صاحب محنت اپنی کوششوں کا کوئی ثمرہ نہیں پاتا۔ اس ممکن الوقوع احتمال کے باوجود مضاربت کے جواز پر تمام اہل علم متفق ہیں۔

اس موقعہ پر امام خطابی رح کے ایک فقہی نکتہ کا ذکر فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

امام موصوف لکھتے ہیں۔

واصل المضاربة فی السنة المزارعة والمساقاة فکیف یجوزان یصح الفرع ویبطل الاصل۔ معالم السنن شرح ابوداؤد ج ۳ ص ۹۲	سنت (احادیث) میں مضاربت کے جواز کی اصل (جڑ اور بنیاد) مزارعت اور مساقاۃ ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اصل تو ختم ہو جائے اور فرع (شاخ) قائم رہے۔

یعنی مضاربت کا جواز کا سارا دارومدار ان روایات پر ہے جن سے مزارعت کا جواز نکلتا ہے تو یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ مزارعت کو تو حرام سمجھا جائے اور مضاربت کو جائز ٹھیرالیا جائے۔ امام احمد کے مسلک کی بنا پر اس اشکال کا یہ حل ہو سکتا ہے کہ بیج مالک زمین کے ذمہ ہو۔ اس طرح نقصان کی شکل میں کاشتکار کی اگر محنت ضائع ہوگی تو مالک زمین کو بیجوں کا نقصان برداشت کرنا پڑیگا۔ بلکہ اجتہاداً اس سے زیادہ یہ پابندی بھی عائد ہو سکتی ہے کہ آلات و وسائل زراعت کے مصارف کا بار بھی مالک زمین پر ڈالدیا جائے۔

قرآن سے استدلال کی اصل حقیقت مزارعت کی حرمت پر آیات قرآن سے استدلال ایک دوراز کار سعی ہے۔ قرآن حکیم نے اس معاملہ میں ایجاباً یا سلباً کوئی واضح حکم نہیں دیا ہے۔ لیس للانسان الا ما سعی اور اس کی ہم معنی آیات سے مزارعت کی حرمت ثابت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس قسم کے تمام معاملات (مضاربت وغیرہ) کو بھی حرام سمجھا جائے۔ حالانکہ واقعتہً ایسا نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۰۷) کہ ممانعت والی احادیث کے راویوں میں حضرت ابوہریرہ کا نام بھی ملتا ہے جو کہ سنہ ۶ھ میں اسلام لائے تھے۔ اور جمہور کی تحقیق کی بنیاد پر خیبر کا واقعہ محرم سنہ ۷ھ کا ہے۔ لیکن ابن حزم اسے سنہ ۶ھ کا ہی واقعہ شمار کرتے ہیں۔ ۱۲ منہ۔

متاخرین اہل علم کا نقطۂ نظر مذکورہ بالا مباحث کے ضمن میں مشہور اصحاب فکر علماء سلف کے مختلف نظریات وافکار ناظرین کے سامنے آچکے ہیں۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متاخرین اہل علم کے سرخیل شاہ ولی اللہ رح کے زاویۂ نظر اور تحقیق کو بھی سمجھ لیا جائے۔

شاہ صاحب رح کی تحریروں سے دونوں گروہ مزارعت کی حلت وحرمت پر استدلال کرتے ہیں۔ اب ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ شاہ صاحب کا رجحان کس طرف ہے۔ اور انھوں نے مختلف احادیث کے درمیان موافقت پیدا کرنے کے لئے کونسا طرز عمل اختیار کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ رح کا زاویۂ نظر

(۱) والارض کلھا فی الحقیقۃ بمنزلۃ مسجد او رباط جعل وقفا علی ابناء السبیل وھم شرکاء فیہ جـ ۲ ص ۱۰۷

در حقیقت ساری زمین بمنزلہ اس مسجد یا رباط (سرائے) کے ہے جو مسافروں کے لئے وقف ہے۔ اور اس میں وہ حصہ دار ہیں۔

(۲) وقد اختلف الرواۃ فی حدیث رافع بن خدیج اختلافا فاحشا وکان وجوہ التابعین یتعاملون بالمزارعۃ ویدل علی الجواز حدیث معاملۃ اھل خیبر واحادیث النہی عنھا محمولۃ علی الاجارۃ بما علی الماذیانات او قطعۃ معینۃ وھو قول رافع او علی التنزیہ والارشاد وھو قول ابن عباس رض او علی مصلحۃ خاصۃ بذالک الوقت من جہۃ کثرۃ مناقشتھم فی ھذہ المعاملۃ حینئذ وھو قول زید بن ثابت

رافع بن خدیج کی حدیث کے راویوں میں نہایت واضح اختلاف پایا جاتا ہے۔ مشہور تابعین کا مزارعت پر عمل درآمد تھا۔ اس کا جواز حدیث خیبر سے ثابت ہے۔ حرمت مزارعت پر مشتمل روایات سے "ماذیانات" یا معین حصۂ زمین والی صورتیں مراد ہیں۔ جیساکہ رافع بن خدیج کی تصریح ہے۔ یا یہ نہی تنزیہی ہے۔ (یعنی اس سے پرہیز بہتر ہے۔) عبداللہ بن عباس کا مسلک یہی ہے۔ یا مناقشات اور تنازعات کی کثرت کی وجہ سے خاص وقتی مصلحت کے طور پر ممانعت فرمادی تھی۔ جیساکہ زید بن ثابت رض کے قول سے معلوم ہوتا ہے۔

حجۃ اللہ البالغۃ جـ ۲ ص ۱۱۶ باب التبرع والتعاون

(۳) مزارعت کے معنی ہیں کہ معین حصہ (ثلث، نصف وغیرہ) کے بدلے زمین بٹائی پر دی جائے، اس میں بیج مالک زمین کے ذمہ ہوتا ہے۔ اور محنت کاشتکار کی طرف سے۔ اس مسئلہ میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے صحابہ اور تابعین کی اکثریت اس کے جواز کی قائل ہے۔ اور یہی مسلک امام احمد ابو یوسف، محمد رحمہ نے اختیار کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک اُسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک مساقاۃ کے ضمن میں جائز ہے۔" (مستقلاً علیحدہ نہیں) سوتی عربی شرح مؤطا ج ا ص ۳۹۸

(۴) "مخابرت و آں عمل کردن در زمین است بشرط بعض خارج، زمین و بذر از یکے باشد و عمل از دیگرے جائز است یا نہ؟ میل فقیر دریں مسئلہ بمذہب امام احمد است از جواز ہر دو" مصفی شرح مؤطا ص ۳۹۱

ایک مصری عالم کا نقطۂ نظر زمانۂ حال کے مصری عالم علامہ عبدالرحمٰن جزیری نے مختلف احادیث مزارعت کے درمیان جو تطبیق دی ہے۔ اس کا ذکر بھی افادہ سے خالی نہ ہوگا۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مزدور، کاشت کار کی شدید ضرورت و حاجت کے مواقع تلاش کرتے رہتے ہیں، ایسے افراد اسی وقت زمین اس کے حوالہ کرتے ہیں، جبکہ "غبن فاحش" کا امکان انھیں نظر آتا ہے۔ اس موقع پر کوئی بیچارا اپنی ضرورت و مجبوری کی بنا پر پھنس جاتا ہے تو اس کی محنت کا پھل مالک زمین طے شدہ شرائط سے زیادہ لے اڑتا ہے۔ اس قسم کے دھوکہ اور نقصان کی صورت اس شریعت میں جائز نہیں ہو سکتی جو مضطر اور مصیبت زدہ انسانوں کی مدد واجب قرار دیتی ہے لہٰذا ایسی مزارعت سے لوگوں کو بچانا چاہیئے جس میں کاشت کار اپنی محنت کا پھل نہ پا سکے۔ اور زمیندار اُسے اُس کی مجبوری اور ناداری کی بنا پر اپنی غلامی کے طوق و سلاسل پہنا دے۔ اس شکل میں مالکیہ کا مسلک کے مطابق فتویٰ دیا جائیگا جو کہ محنت اور زمین کے اعتبار سے نفع میں مساوات کے قائل ہیں تاکہ اس طرح کوئی فریق اپنے ساتھی کے حق میں دخل اندازی نہ کرسکے۔

لیکن جب خیر، نیکی اور ہمدردی کا جذبہ لوگوں میں عام ہو اور دونوں فریق میں سے کوئی بھی اپنے حق سے زیادہ لینا نہ چاہتا ہو، اور نہ کسی فریق کی حق تلفی کا کوئی اندیشہ ہو۔ تو پھر مزارعت کے جواز کا فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۳ ص ۲۴

خاتمہ کلام | مزارعت کے بارے میں مخالف و موافق دلائل اور آئمہ سلف و خلف کے افکار و آراء ناظرین کے سامنے آچکے ہیں۔ اب وہ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آثار و سنن کی روشنی میں کونسا مسلک صحیح ہو سکتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اس تحقیقی مطالعہ میں اس مسئلہ کا کوئی پہلو نگاہ سے اوجھل رہ گیا ہو۔ اس لئے اہل علم حضرات سے التماس ہے کہ وہ اس سلسلہ کی معلومات منظر عام پر لائیں تاکہ بحث و مذاکرہ اور فکر و تحقیق کے بعد کسی واضح فیصلہ پر اتفاق کیا جا سکے۔

ترجمان القرآن "پر خیانت" کی دست درازیاں

"ترجمان القرآن" کو ان دنوں جو سب سے بڑی مشکل درپیش ہے وہ یہ ہے کہ پوری احتیاط سے پرچہ پوسٹ کرنے کے باوجود بہت ہی کثرت سے شکایت نامے آ رہے ہیں کہ پرچہ خریداروں کو نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ بعض خریداروں کو دوبارہ پرچہ بھیجنے کے باوجود نہیں مل سکا۔ خصوصاً انڈیا کے خریداروں اور ایجنٹوں کے پرچے ـــ عام پرچے ہی نہیں، رجسٹرڈ پیکٹ تک نہایت کثرت سے اڑائے جا رہے ہیں۔ پھر اس طرح کی اطلاعات بھی مل چکی ہیں کہ پرچہ ڈاک خانہ میں پہنچ جاتا ہے، لیکن فرستندہ کو تقسیم نہیں ہوتا، علاوہ بریں نظام ترسیل یہ ہی رسالے کے پیکٹ بعض اوقات کئی کئی روز پڑے رہتے ہیں اور بروقت روانہ نہیں کئے جاتے۔ اس سلسلے میں ڈاک کے افسروں کو توجہ دلائی گئی ہے لیکن کسی جوابی کارروائی کا ہمیں علم نہیں ہو سکا!

اِن حالات میں ہم محکمۂ ڈاک کے کارکنوں سے گذارش کرتے ہیں کہ :-

(۱) آپ حضرات ایک اسلامی ریاست کے ملازم ہونے یا اپنے مسلمان ہونے یا کم از کم انسان ہونے کا کچھ تو لحاظ کریں اور اپنے اخلاق کا معیار بلند کریں۔

(۲) جو اصحاب آپ میں سے فرض شناس اور امانت دار ہوں وہ صرف اپنی ذات کی ذمہ

داری لے کے ہی نہ بیٹھ رہیں بلکہ وہ اپنے ساتھیوں کی بدعنوانیوں پر اُن کو ٹوکیں اور محکمہ کو بد دیانتی سے پاک کرنے کی کوشش کریں ۔

(۳) آپ میں سے جو اصحاب اپنی خواہشات کے سامنے بالکل بے بس ہوں اور ترجمان القرآن کو بہر حال مفت ہی پڑھنا چاہتے ہوں تو وہ براہ کرم ہمیں براہ راست اپنا پتہ بھیجدیں تاکہ ہم اُن کی خدمت میں مفت پرچہ بھجوانے کا انتظام کریں ۔ اور خریداروں کی حق ماری نہ ہو۔ ہم محکمہ ڈاک کے افسروں سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ اپنے ہاں کے ایسے ملازمین کی فہرست ہمارے دفتر کو بہم پہنچا دیں ۔

خریداران ترجمان القرآن سے درخواست ہے کہ وہ ان حالات کا مقابلہ کرنے میں ہماری مدد حسب ذیل طریقوں سے کریں :-

(۱) مقامی ڈاک خانے (یا پوسٹ مین) سے اپنے پرچے کے بارے میں استفسار کرتے رہیں ۔

(۲) اگر مہینے کے وسط تک پرچہ نہ ملے تو انسپکٹر جنرل ڈاک خانہ جات کو شکایت نامہ بھیجیں ۔

(۳) اگر آپ کا پرچہ ڈاک خانے میں کھولا یا روکا جاتا ہو تو محکمہ کے ملازمین سے براہ راست شکایت کریں ۔ نیز افسران بالا کو مطلع کریں ۔

(۴) اگر کہیں محکمہ ڈاک کا کوئی ملازم پرچے کو فروخت کرتا پایا جائے تو اس کی اطلاع ہمیں بھی اور محکمہ ڈاک کے افسروں کو بھی فوراً دیں ۔

انڈیا کے خریداروں کا معاملہ نسبتۃً زیادہ پیچیدہ ہے ! تاہم دفتر اس امر کا جلد ہی کوئی مناسب انتظام کر دے گا کہ پرچہ باقاعدگی سے پہنچ سکے ۔ اللہ تعالیٰ ہماری مشکلات کو حل فرمائے ۔

منیجر ترجمان القرآن

سلسلہ مباحث

"اسلامی ریاست"

مبحث اول

کارکنوں کی ذمہ داریاں اور ان کے اوصاف

از

(مولنا امین احسن صاحب اصلاحی)

(۲)

اسلامی حکومت کے امراء اور عمال میں کیا اوصاف مطلوب ہیں؟

اب ہم ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ان اوصاف کو پیش کرینگے جو ایک اسلامی حکومت کے امراء و عمال میں مطلوب ہیں۔ اور جن کے بغیر کوئی شخص اسلامی حکومت میں کوئی عہدہ اگر سنبھال بیٹھتا ہے۔ تو وہ دنیا میں لوگوں کے لئے وبال بنتا ہے۔ اور آخرت میں وہ عہدہ اس کے لئے وبال ہوگا۔ لیکن ان اوصاف کو بیان کرنے سے پہلے اس سوال پر غور کرلینا ضروری ہے کہ ایک اسلامی حکومت اپنے عمال اور کارکنوں کا اصل فریضہ کیا قرار دیتی ہے؟ اس فریضہ کے متعین ہوجانے کے بعد ان اوصاف کا علوم کرلینا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں رہ جائیگا جو اس کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ یہ فریضہ خود ہی بتا دیگا کہ وہ کیا اوصاف ہیں جو اس کے شایانِ شان ہیں۔ اور کیا اوصاف ہیں جو اس کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

یہ ساری بحث ان لوگوں کو نہایت عجیب معلوم ہوگی، جو حکومت اور اس کی ذمہ داریوں سے متعلق صرف جاہلی تصورات ہی سے آشنا ہیں اور اپنے لئے اسوۂ حسنہ امریکہ اور انگلستان کی حکومتوں اور ان کے ارباب کار ہی کو سمجھتے ہیں۔ نئی درسگاہوں اور سول سروس کے مقابلہ کے مختلف امتحانوں کے ذریعہ سے ان کو حکمرانی اور طرزِ حکمرانی کے بابت جو تصورات دیئے گئے ہیں اور اس کے لئے جو آداب و آئین انکو سکھائے گئے ہیں۔ وہ ہمارے اسلامی تصورات اور اسلامی آداب و آئین سے نہ صرف مختلف ہیں۔ بلکہ بیشتر ان میں تضاد ہے۔ اسلامی نظام میں جو باتیں ایک گورنر کے اولین فرائض میں داخل ہیں۔ موجودہ جاہلی نظاموں کے اندر ان باتوں کا تعلق کسی مسجد

کے مُلا سے ہے۔ اسی طرح جو طرزِ زندگی موجودہ نظامِ حکومت میں حکمرانی کے چہرہ کا اصلی غازۂ جمال سمجھا جاتا ہے اسلامی ماحول کے اندر وہ فرعونیت بلکہ عین شیطنت ہے۔ دونوں کے درمیان اس غیر معمولی دوری کی وجہ سے موجودہ زمانے کی مغرب سے مرعوب نسلوں کو اسلامی نظام کا معتقد بنانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ زندگی کے موجودہ نظریات جب تک یکسر بدل نہ جائیں اور موجودہ اخلاقی اقدار کی جگہ اسلامی اقدار کی عظمت و محبت دِلوں میں رچ بس نہ جائے۔ اس وقت تک اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے۔ کہ لوگ ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں کو سمجھ سکیں اور اپنے اندر وہ اوصاف و اخلاق پیدا کرنے کی طرف مائل ہوں جو ایک اسلامی حکومت کے کارکنوں کے اندر مطلوب ہیں لیکن ایک اسلامی حکومت جب بھی قائم ہوگی اس تبدیلی کے بغیر قائم نہیں ہوگی۔ اس وجہ سے ان دونوں کے درمیان جو دُوری ہے اس کو دیکھ کر گھبرانے اور مایوس ہونے کے بجائے اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ ایک جماعت خالص اسلامی تصوراتِ اجتماعی و اخلاقی کے رنگ میں رنگی ہوئی پیدا ہو جائے جو پیشِ نظر اسلامی انقلاب کو برپا بھی کر سکے اور اس کے نتیجہ کے طور پر جو ذمہ داریاں عائد ہوں ان کو نباہ بھی سکے۔ اگر اس اندیشہ کی وجہ سے کہ لوگ ان باتوں کو سن کر ناک بھوں چڑھائیں گے اور ان پر مُلائیت کی پھبتی چست کریں گے اس کام کو اٹھا رکھا گیا تو یہ بہت پیچھے جا پڑیگا۔ اگرچہ موجودہ ماحول میں بعض لوگوں کو یہ کام بڑا دشوار دکھائی دیتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر معاملات کی باگ کسی صالح قیادت کے ہاتھ میں آجائے تو معلوم ہوگا کہ ہماری سوسائٹی میں ان سارے فسادات کا منبع صرف مٹھی بھر اشخاص ہیں لیکن چونکہ ان کو قیادت کی جگہ حاصل ہے۔ اس وجہ سے پوری قوم کو انہوں نے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ اس قیادت کے بدلتے ہی پوری قوم صبح و شام میں اس تیزی کے ساتھ بدلے گی کہ آج اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دیر جو کچھ ہوگی وہ صرف ایک صالح جماعت کی تیاری میں ہوگی۔

اسلامی حکومت کے عمال کا اصلی فریضہ

اب آیئے دیکھئے اسلامی نظام کے اندر خلیفہ سے لیکر اس کے والیوں اور گورنروں تک ہر شخص کو اپنے پیشِ نظر بحیثیت مقصد اور اصلی فریضہ کے کیا چیز رکھنی پڑتی ہے جس کو ترک یا نظر انداز کر دینے کے بعد ریاست کے نقطۂ نظر سے ان کا وجود بے مصرف ہو جایا کرتا ہے۔ اس

سلسلہ میں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نامہ پیش کرتے ہیں جو آپ نے عمرو بن حزم کو اس وقت لکھ کر دیا تھا۔ جب آپ نے ان کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تھا۔ اس نامہ (INSTRUMENT OF INSTRUCTION) سے اندازہ ہو سکے گا کہ جس طرح ایک اسلامی ریاست کا مقصد یہ ہے کہ اس کی رہنمائی میں معاشرہ کا ارتقاء خدا کی رضا کی سمت میں ہو اسی طرح اسلامی حکومت کے خلیفہ اور اس کے کارکنوں کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ اس ارتقاء کے لیڈر ہوں اور وہ معاشرہ کو ایک طرف تو ان تمام چھوٹی بڑی خرابیوں سے پاک کریں جو اس ارتقاء کی راہ میں مزاحم ہو سکتی ہیں اور دوسری طرف ان تمام چھوٹی بڑی اچھائیوں کی تعلیم دیں جو اس ارتقاء میں معین ہو سکیں۔ اپنے اس مقصد کی وجہ سے اسلامی حکومت کے کارکن لوگوں سے صرف حکومت کے مطالبات وصول کرنے اور اس کا اقتدار تسلیم کرانے کے ایجنٹ ہی نہیں ہوتے بلکہ شفیق باپ اور نیک دل معلم کی طرح ان کی غلطیوں، ان کی کمزوریوں اور ان کی جہالتوں کو دور کرنے کے ذمہ دار بھی ہوتے ہیں۔ آنحضرتؐ کے مذکورہ نامۂ مبارک کے ضروری حصہ کا ترجمہ یہ ہے:۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہدایت نامہ ہے"

"اے ایمان والو! اللہ سے جو عہد تم نے باندھے ہیں ان کو پورا کرو۔ یہ وہ ہدایات ہیں جو اللہ کے نبی اور رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عمرو بن حزم کو اس وقت دیں جب ان کو یمن پر مقرر کیا۔ ان کو ہر معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہنے کی ہدایت کی کیونکہ اللہ انہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اس سے ڈرتے رہتے ہیں جو نیکوکار ہیں۔ اور اس کو یہ ہدایت کی کہ حق پر قائم رہے۔ جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے اور لوگوں کو بھلائی کی خوشخبری اور اسی کا حکم سنائے اور لوگوں کو قرآن کی تعلیم دے۔ اور ان میں دین کی سمجھ پیدا کرے اور لوگوں کو ناپاکی کی حالت میں قرآن کو ہاتھ لگانے سے روکے۔ اور لوگوں کو ان کے حقوق اور ذمہ داریوں سے آگاہ کرے۔ حق کے معاملہ میں لوگوں کے لئے نہایت نرم ہو۔ اور اگر وہ کسی ظلم کا ارتکاب کریں تو ان پر سختی کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ظلم کو ناپسند کیا ہے۔ اور اس سے روکا ہے چنانچہ اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ "الا لعنة الله على الظلمين" ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے

لے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث اس سلسلہ کے کسی دوسرے مضمون میں ملے گی۔

اور لوگوں کو جنت اور جنت میں لیجانے والے اعمال کی بشارت دے اور دوزخ اور دوزخ میں لیجانے والے اعمال سے ڈرائے اور لوگوں کی دلداری کرے۔ یہاں تک کہ لوگ دین کا فہم پیدا کرنے کی طرف مائل ہوں۔ اور لوگوں کو حج کے آداب، اس کے طریقے اور اس فرض کی اہمیت سے آگاہ کرے۔ حج اکبر تو حج اکبر ہی ہے حج اصغر سے مراد عمرہ ہے اور لوگوں کو صرف ایک چھوٹے کپڑے میں نماز پڑھنے سے روکے، کپڑا کم از کم اتنا ہونا چاہیئے کہ اس کے دونوں گوشے موڑ کر وہ اپنے کندھوں پر ڈال سکیں۔ اور لوگوں کو اس بات سے روکے کہ کوئی شخص ایک کپڑے میں اس طرح نہ بیٹھے کہ اس کی ستر کھل جائے۔ اور اس بات سے بھی روکے کہ لوگ اپنے بال سر کے پیچھے جوڑے کی صورت میں باندھیں۔ اگر لوگوں میں کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہو تو اس بات کی نگرانی کرے کہ لوگ قومی اور قبائلی عصبیت کے نعرے بلند کرنے پائیں بلکہ ان کی پکار صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے نام پر ہو۔ اگر کوئی گروہ اللہ کے نعرے کے بجائے اپنے قومی اور قبائلی نعروں پر اصرار کرے تو ان کی تلوار سے خبر لی جائے۔ یہاں تک کہ وہ قومی اور قبائلی عصبیت سے دستبردار ہو کر اللہ وحدہٗ لاشریک کا نعرہ اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔ اور لوگوں کو ٹھیک طریقہ سے وضو کرنے کا حکم دے کہ لوگ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھوئیں اور اپنے سروں کا مسح کریں جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اور نمازوں میں اوقات کی پابندی اور رکوع اور سجدہ کے اتمام اور خشوع کا حکم دے فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھی جائے، اور ظہر کی دوپہر میں، زوال کے بعد۔ اور عصر کی نماز جب سورج منہ موڑ چکا ہو۔ اور مغرب رات کے داخل ہوتے ہی، اس میں اتنی تاخیر نہ کی جائے کہ تارے نمایاں ہو جائیں عشاء اوّل شب میں۔ جمعہ کے لئے یہ حکم دیا جائے کہ جب اس کی اذان ہو تو لوگ مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ آئیں اور گھروں سے نکلنے سے پہلے غسل کریں۔[۱]"

(اس کے بعد غنیمت، صدقہ اور خراج اور جزیہ کے احکام کی تفصیل ہے جن کو ہم نے یہاں کے مضمون سے غیر متعلق ہونے اور اختصار کے خیال سے نظر انداز کر دیا ہے۔)

بعینہٖ اس حقیقت کو حضرت عمرؓ نے اختصار و جامعیت کے ساتھ اپنے ایک خطبہ میں یوں بیان فرمایا:-

اللّٰھم انی اشھدک علی امراء الامصار — اے اللہ میں تجھ کو اپنے عمال پر گواہ بناتا ہوں میں

---

[۱] ابن ہشام مطبوعہ مصر جلد ۴ صفحہ ۲۴۱

فانی انما بعثتہم لیعلموا الناس دینہم وسنۃ نبیہم ویعدلوا علیہم ویقسموا فیئہم بینہم ویرفعوا الیّ ما اشکل علیہم من امرہم

میں نے ان کو صرف اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کا دین اور ان کے نبی کی سنت سکھائیں، ان کے ساتھ عدل قائم کریں اور ان کی فئے ان کے درمیان تقسیم کریں، اور اگر ان کو کوئی مشکل پیش آئے۔ تو اس کو میرے سامنے پیش کریں۔

ایک دوسرے خطبہ میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا۔

انی لم استعمل عمالا لیضربوا ابشارکم ولیشتموا اعراضکم ویأخذوا اموالکم ولکنی استعملہم لیعلموکم کتاب ربکم وسنۃ نبیکم

میں نے اپنے عمال اس لیے نہیں مقرر کیے ہیں کہ وہ تمہیں ماریں پیٹیں، تمہاری آبرو ریزی کریں اور تمہارے مال ہڑپ کریں۔ میں نے تو انہیں اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ تم کو تمہارے پروردگار کی کتاب اور اس کے رسول کے طریقہ کی تعلیم دیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امرا اور حضرت عمرؓ کے ان ارشادات پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت کے عمال و امراء کا مقدم ترین فرض لوگوں کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے واقف کرانا اور ان پر عمل کرانا ہے۔ دوسرے سارے فرائض اس کے بعد ہیں۔ اور یہ فرض پوری وسعت کے ساتھ ان پر ڈالا گیا ہے[1]۔ اسلامی نقطۂ نظر سے کسی علاقہ کے عوام کے اندر جو کمزوری یا خرابی بھی موجود ہے۔ خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ اس کی اصل ذمہ داری اس علاقہ کے حاکم پر ہے۔ اگر ان لوگوں کو ان کے شہری حقوق اور فرائض کا پتہ نہیں ہے۔ تو اس کی ذمہ داری بھی اس پر ہے۔ اور اگر لوگ اسلامی طریقہ غسل و طہارت سے ناآشنا ہیں۔ تو اس کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔ کسی علاقے کا حاکم صرف اتنی بات سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ کہ اس نے اس علاقہ میں امن قائم کر رکھا ہے اور لوگوں سے حکومت کے واجبات برابر وصول

---

[1] ظاہر بات ہے کہ اس کے بغیر تو وہ بنیاد ہی ڈھ جائیگی جس پر اسلامی معاشرہ اور ریاست استوار رہتے ہیں

کر رہا ہے۔ اگر اس نے اتنا کر دیا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنے فرائض کے بعض اجزا پورے کر دیئے ہیں لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ساری انتظامی مشینری اس طرح ترتیب دے کہ وہ بیک وقت لوگوں کو تعلیم بھی دے سکے، ان کے اخلاق کی تربیت بھی کر سکے اور ان کے اندر امن اور عدل بھی قائم کر سکے۔ حضرت عمرؓ کے حالات یہ جو ہم پڑھتے ہیں کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لوگوں کی گرفت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ زمزم پر پانی پینے والوں کا ہجوم زیادہ ہو جاتا ہے اور لوگ آپس میں کشمکش شروع کر دیتے ہیں اور وہاں بھی لوگوں کو آداب و تہذیب سکھانے کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اس امر کو اچھی طرح جانتے تھے کہ قوم میں جو انفرادی یا اجتماعی بیماری بھی موجود ہے۔ اس کے علاج کی اصلی ذمہ داری انہیں پر ہے۔

اپنا عمل دوسروں کے لئے نمونہ اس فرض کو ٹھیک طور پر انجام دینے کیلئے جو چیز بطور اصول ہمارے ان بزرگ اسلاف نے پیش نظر رکھی اور جس کی ان کو تعلیم دی گئی وہ یہ تھی کہ جس طرز کی تبدیلی تم لوگوں میں پیدا کرنا چاہتے ہو اس کے عملی نمونہ خود ہو۔ تاکہ لوگ تم کو دیکھ کر اس تبدیلی کو اختیار کریں کسی بات پر عمل درحقیقت اس بات کی تائید میں بہت بڑی دلیل ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح کسی بات پر عمل نہ کرنا، عمل نہ کرنیوالوں کی طرف سے اس بات کی مخالفت میں ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی بات پر خود عامل نہیں ہوتے، اور محض زبانی وعظ یا قانون کے بل پر دوسروں کو اس کا پابند بنانا چاہتے ہیں، ان کو اس مقصد میں کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔ لوگوں کو ان کے عمل کی دلیل ان کے قول کی دلیل سے زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے۔ اور زیادہ اپیل کرتی ہے۔ آج تک دنیا میں کبھی یہ نہیں ہوا کہ زانیوں اور شرابیوں نے لوگوں میں زنا اور برائی کا احساس پیدا کیا ہو، خائنوں اور مسرفوں نے لوگوں میں امانت اور اعتدال کا جذبہ بیدار کیا ہو، راشیوں اور چور بازاری کرنے والوں نے لوگوں کو دیانت اور راستبازی کی روش سکھائی ہو اور کافرانہ عادات و خصائل اور جاہلی افکار و نظریات کے معتقدوں اور مریدوں نے اسلامی نظام زندگی برپا کیا ہو۔ ایسا نہ کبھی ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہو سکے گا۔ یہ چیز اس کائنات کے مزاج اور اس کی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اسی اصول کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:۔

ان الناس لایزالون مستقیمین ما — لوگ اس وقت تک اپنی سیدھی راہ پر قائم رہیں گے

استقامت لهم ائمتهم وهداتهم — جب تک ان کے حکام اور راہنما سیدھے راستہ پر رہیں گے

ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا:۔

"الرعیۃ مؤدیۃ الی الامام ما ادی الامام الی اللہ۔ فاذا رتع الامام رتعوا — لوگ امیر کے حقوق اس وقت تک ادا کریں گے جب تک امیر اللہ کے حقوق ادا کریگا۔ جب امیر بے قید ہو جائیگا تو لوگ بھی بے قید ہو جائیں گے"

اسی اصول کی طرف حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو ایک نامہ میں توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:۔

"سب سے زیادہ خوش قسمت حاکم اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جس کے سبب سے اس کی رعایا خوشحال ہو اور سب سے زیادہ بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب سے اس کی رعایا بدحال ہو۔ تم خود اپنے آپ کو کجروی سے بچاؤ تاکہ تمہارے ماتحت کجروی نہ اختیار کریں۔ ورنہ تمہاری مثال اس چوپایہ کی ہوگی جس نے کسی جگہ سبزہ دیکھا، اور اس میں چرنے کے لئے آگے بڑھ گیا تاکہ فربہ ہو جائے حالانکہ یہ فربہی اس کے لئے پیغام موت ثابت ہوئی" (کتاب الخراج ص۳)

امراء اور حکام کی دیانت اور امانت کا اثر جس طرح عوام پر پڑا کرتا ہے۔ اس کا کسی قدر اندازہ فتح مدائن کے موقع پر فوج کی دیانت سے ہو سکتا ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں کو جس کثیر مقدار میں اور جتنا بیش قیمت سروسامان ہاتھ آیا اس کی تفصیلات بیان میں نہیں سما سکتیں لیکن سروسامان سے زیادہ فوج کی دیانت قابلِ تعریف تھی کہ ایسے آزمائش کے موقع پر اتنی بڑی فوج کے اندر، ایک شخص بھی ایسا نہیں نکلا جس کی دیانت پر شبہ کیا جا سکتا۔ سپہ سالارِ فوج نے لوگوں کی اس دیانت داری کو دیکھ کر کہا۔ اگر اہلِ بدر کی شان میں وہ کچھ نہ کہا گیا ہوتا جو کہا گیا ہے تو میں یہ کہتا کہ ان لوگوں کو اہل بدر کی فضیلت حاصل ہوئی۔ جابر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ اہل قادسیہ میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس نے آخرت کے ساتھ دنیا طلبی کی کوئی لگاوٹ رکھی ہو۔ تین شخصوں کے بارہ میں شبہ کیا گیا لیکن تحقیق کی گئی تو وہ بھی زاہدوں کے زاہد نکلے۔ حضرت عمرؓ نے جب سروسامان پر ایک نظر ڈالی تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکل گیا کہ "ان قوما ادوا ھذا لامناء" جن لوگوں نے یہ سامان حاضر کر دیا ہے۔ وہ بلاشبہ دیانتدار لوگ ہیں۔ اس پر حضرت علی بن ابی طالبؓ نے لوگوں کی اس دیانت کا فلسفہ بیان کیا اور وہ نکتہ ارشاد

فرمایا جس تک انہیں کی دقیقہ رس نگاہ پہنچ سکتی تھی۔ فرمایا: انک عففت فعفت رعیتک ولو رتعت لرتعت۔ آپ خود دیانتدار ہیں، اس لئے آپ کی رعایا بھی دیانتدار ہے۔ اگر آپ خود بددیانت ہوتے تو لوگ بھی خوب ہاتھ رنگتے۔[1]

بے لاگ عدل | بے لاگ عدل اسلامی حکومت کی ریڑھ کی ہڈی اور اس کا مقصد وجود ہے۔ اس وجہ سے اس کے کارکنوں کے لئے ضروری ہے کہ عدل کرنے میں نہ وہ کسی سے خوف کھائیں اور نہ کسی کی رعایت کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر "محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹا جاتا" یہ العیاذ باللہ کوئی شاعری نہیں ہے بلکہ سرتاسر حقیقت ہے۔ اسلامی حکومت کو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عدل کی تصویر ہونا چاہیئے اور اس معاملہ میں نہ بڑے اور چھوٹے میں کسی قسم کا فرق ہونا چاہیئے اور نہ کسی مصلحت اور مروّت کا لحاظ ہونا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:-

"مجھ کو سب سے زیادہ محبوب اور قیامت کے روز مجھ سے قریب تر امام عادل ہوگا، اور مجھ کو سب سے زیادہ مبغوض اور سب سے زیادہ سخت عذاب میں قیامت کے دن امام ظالم ہوگا۔"

حضرت ابوبکرؓ نے اپنی گورنمنٹ کا بنیادی مقصد یہ بتایا تھا:-

والضعیف فیکم قوی عندی	اور تم میں جو بے اثر ہیں، میرے نزدیک وہ با اثر ہیں،
حتی ازیح علیہ حقہ ان شاء اللہ	یہاں تک کہ میں ان کا حق واپس دلا دوں (ان شاء اللہ)
والقوی فیکم ضعیف عندی	اور تم میں جو با اثر ہیں وہ میرے نزدیک بے اثر ہیں،
حتی اخذ الحق منہ ان شاء اللہ	یہاں تک کہ میں ان سے دوسروں کا حق وصول کر لوں
(سیرت الصدیق ابی بکر، محمد حسین ہیکل، ص ۱۰)	(ان شاء اللہ)

حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد اسی حقیقت کا اعادہ ان الفاظ میں فرمایا:-

واللہ ما منکم اقوی عندی	خدا کی قسم تم میں سے کوئی شخص میرے نزدیک ایک
من الضعیف حتی اخذ لہ الحق	بے اثر سے زیادہ با اثر نہیں ہے جب تک کہ میں

[1] "الفاروق عمر" تالیف محمد حسین ہیکل۔

ولا اضعف عندی من القوی حتی اٰخذ الحق منه

اس کا حق وصول نہ کر لوں، اور نہ کوئی شخص ایک بااثر سے زیادہ بے اثر ہے جب تک کہ میں اس سے دوسرے کا غصب کیا ہوا حق وصول نہ کر لوں۔

یعنی حضرت عمرؓ کی حکومت میں آدمی کے ضعف و قوت کا انحصار اس کے مالی وسائل کی کمی بیشی، اس کے خاندان کی شرافت ورذالت اور حکومت کے اندر اس کی رسائی اور نارسائی پر نہیں تھا بلکہ اس بات پر تھا کہ وہ حق پہ ہے یا باطل پر۔ ایک شخص کتنا ہی بے وسیلہ اور بے سہارا کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ مظلوم ہے اور اس کا کوئی حق چھینا گیا ہے تو حضرت عمرؓ کی حکومت میں سب سے زیادہ طاقتور اور با اثر شخص اسوقت تک وہی شخص ہوتا تھا جب تک اس کا چھنا ہوا حق اس کو واپس نہ مل جائے کیونکہ اس وقت تک حکومت کی پوری طاقت اس کی پشت پر ہوتی تھی اسی طرح کوئی شخص کتنے ہی وسیع اثرات اور کتنے ہی قوی وسائل و ذرائع رکھتا ہو لیکن اگر وہ ظالم اور غاصب ہے تو حضرت عمرؓ کی حکومت میں وہ شخص اس وقت تک سب سے زیادہ کمزور اور بے وسیلہ ہوتا جب تک اس کے حلق سے دوسرے کا نگلا ہوا حق اگلوا نہ لیا جائے، کیونکہ اس وقت تک حکومت کی پوری مشینری اس کے خلاف ہوتی تھی۔ اور کسی گوشہ سے اس کو کسی حمایت یا سفارش کی امید نہیں ہو سکتی تھی۔

اس فرض کو حضرت عمرؓ کی حکومت نے جس طرح ہر قسم کی رعایت اور ہر قسم کے خوف ولحاظ سے بے پرواہ ہو کر ادا کیا ہے وہ ایک صحیح اسلامی حکومت کے لئے ایک مثال ہے اس وجہ سے ہم یہاں فاروقی عدالت کے دو واقعے نقل کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک سے یہ واضح ہوگا کہ عدل کے قائم کرنے میں حضرت عمرؓ کی حکومت رشتہ وقرابت کے لحاظ میں کتنی بے دردواقع ہوئی تھی اور دوسرے سے یہ واضح ہوگا کہ ان کی حکومت میں خاندانی اثرات اور سرکاری تعلقات کی بے اثری اور بے وقعتی کا کیا عالم تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود اپنے اہل وعیال کو یہ تنبیہ فرماتے رہتے تھے کہ "لا اعلمن احدا وقع فی شیئ مما نہیت عنہ الا اضعفت لہ العقوبۃ۔ جن باتوں کی میں نے ممانعت کر دی ہے اگر تم میں سے کوئی ان میں مبتلا پایا گیا۔ تو یاد رکھو اس کو دوگنی سزا دوں گا۔"

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن، نے مصر میں ایک روز شراب پی اور بدمست ہوگئے۔ اس کے بعد وہ خود حضرت عمرو بن عاص کی (جو اس وقت مصر کے گورنر تھے) خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے جرم کا اقرار کرکے اُن سے درخواست کی کہ ان پر حد جاری کی جائے۔ عمرو بن عاص کہتے ہیں، میں نے اُن کو ڈانٹ ڈپٹ کر ٹال دینا چاہا لیکن وہ مُصر ہوئے کہ اگر ان پر حد نہ جاری کی گئی تو جب وہ مدینہ لوٹیں گے اس کی شکایت اپنے والد سے کریں گے۔ عمرو بن عاص کہتے ہیں، مجھے ڈر ہُوا کہ اگر میں نے حد جاری نہ کی تو یہ فی الواقع حضرت عمرؓ سے شکایت کردینگے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ میں معزول کردیا جاؤنگا۔ چنانچہ میں نے انکو اپنے مکان کے صحن میں بُلا کر ان پر حد جاری کردی۔ اور انہوں نے خود مکان کے ایک گوشہ میں جاکر اپنا سر مونڈ لیا۔ میں نے اس واقعہ کی کوئی اطلاع حضرت عمرؓ کو نہیں دی لیکن چند ہی دنوں کے بعد مجھے ان کا مندرجہ ذیل عتاب نامہ ملا۔

"امیر المومنین عبداللہ عمر کی طرف سے عاصی بن عاصی کے نام ــــ اے ابن عاص۔ مجھ کو تمہاری جسارت اور عہد شکنی پر تعجب ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ تم معزول کردیئے جانے کے سزاوار ہو۔ تم نے عبدالرحمٰن پر اپنے مکان کے صحن کے اندر حد جاری کی اور مکان کے اندر ہی اس کا سر مونڈا، حالانکہ تم کو اچھی طرح علم ہے کہ اس قسم کی رعایت میری روش کے بالکل خلاف ہے۔ عبدالرحمٰن تمہاری رعیت میں سے ایک فرد تھا، تمہارے لئے لازم تھا کہ تم اس کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرتے جیسا دوسروں کے ساتھ کرتے ہو۔ لیکن تم نے اس کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ اس غرض پر کیا کہ وہ امیر المومنین کا بیٹا ہے، حالانکہ تم کو پتہ ہے کہ حق کے معاملہ میں میرے یہاں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہے۔ اس وجہ سے تم کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ میرا خط پاتے ہی عبدالرحمٰن کو میرے پاس روانہ کرو تاکہ میں اس کو اس کے کیئے کا مزا چکھاؤں۔"

عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے عبدالرحمٰن کو حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجا اور ساتھ ہی اپنی غلطی کا اقرار کیا کہ فی الواقع مجھ سے یہ بڑی تقصیر ہوئی کہ میں نے عبدالرحمٰن پر اپنے مکان کے اندر حد جاری کی حالانکہ دوسرے مسلمانوں اور ذمیوں پر حد جاری کرنے کے بارہ میں میرا یہ معمول نہیں تھا۔ میں نے یہ معذرت نامہ عبداللہ بن عمر کے ہاتھ بھیجا اور انہی کے ساتھ عبدالرحمٰن کو روانہ کیا۔ چونکہ عبدالرحمٰن کو

حضرت عمرؓ کی ہدایت کے بموجب صرف کاٹھی پر سوار کر کے بھیجا گیا تھا۔ اس وجہ سے ان غریب کے لئے حرکت کرنا بھی دشوار تھا۔ مدینہ پہنچے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بیچ میں پڑے اور سفارش کی کہ امیرالمومنین ان پر حد جاری ہو چکی ہے اب ان کو کوئی مزید سزا نہ دی جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی بات کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ عبدالرحمٰن نے باپ کے تیور دیکھے تو چلّائے کہ میں بیمار ہوں اور آپ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ روایتوں میں ہے کہ اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے ان کو سزا دی اور ان کو قید کیا۔ یہاں تک کہ وہ بیمار ہوئے اور انتقال فرما گئے۔[۱]

اب بے لاگ عدل کی ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ عمرو بن عاص مصر کے فاتح بھی تھے اور وہاں کے گورنر بھی تھے۔ اُن کے بیٹے محمد کا قصہ ہے کہ اس نے ایک مصری کے کوڑے مارے اور مارتے ہوئے یہ کہا کہ "یہ لے، میں ایک بڑے باپ کا بیٹا ہوں" عمرو بن عاص نے مصری کی دادرسی کرنے کے بجائے الٹے اس کو گرفتار کر لیا، کہ کہیں مدینہ جا کر امیرالمومنین سے شکایت نہ کر دے۔ مصری کچھ مدت کے بعد جب رہا ہوا تو سیدھے مدینہ پہنچا اور اس ظلم کی شکایت حضرت عمرؓ سے کی۔ حضرت عمرؓ نے مصری کو اپنے پاس روک لیا، اور عمرو بن عاص اور ان کے بیٹے کو مصر سے طلب فرمایا۔ دونوں مجلس قصاص میں حاضر کئے گئے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے مصری کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں کوڑا دے کر فرمایا "یہ لے اور پیٹ اس سے اس بڑے باپ کے بیٹے کی خبر لے" مصری نے محمد کو مارا اور لہولہان کر دیا۔ اور اس دوران میں حضرت عمرؓ برابر فرماتے رہے کہ "ہاں مار اس بڑے باپ کے بیٹے کو!" جب مصری مار چکا اور کوڑا حضرت عمرؓ کو واپس کرنے لگا۔ تو حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا "ایک آدھ عمرو بن عاص کی چندیا پر رسید کر کیونکہ انہی کے بل پر ان کے برخوردار نے تجھے کوڑے مارنے کی جرأت کی۔" عمرو بن عاص نے

---

[۱] میں نے یہ واقعہ محمد حسین ہیکل کی کتاب "الفاروق عمرؓ" سے لیا ہے۔ اس میں تصریح ہے کہ حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن پر دوبارہ حد جاری کی۔ لیکن یہ بات خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے۔ (جلد ۲ صفحہ ۳۲۱) بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان پر حد نہیں جاری کی تھی، بلکہ باپ ہونے کی حیثیت سے تادیب کے طور پر کچھ سزا دی تھی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔

عرض کی کہ امیر المؤمنین! انصاف کا حق ادا ہو گیا۔ مصری نے بھی کہا کہ امیر المؤمنین میرے ساتھ جس نے زیادتی کی تھی، میں نے اس سے بدلہ لے لیا اب کسی اَور سے بدلہ لینے کا میں خواہشمند نہیں ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تجھے اختیار ہے ورنہ اگر تو ان کو بھی مارتا، تو میں اِن کے اور تیرے بیچ میں حائل ہونے والا نہیں تھا یہاں تک کہ تو خود ان کو چھوڑتا۔ اس کے بعد عمرو بن عاص کی طرف نہایت غضبناک انداز میں دیکھ کر بولے، "عمرو! تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنا لیا، حالانکہ ان کی ماؤں نے اِن کو آزاد جنا تھا!"

فرائض کی براہِ راست انجام دہی اور اپنی ذات سے انتقام حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:۔

"میں ایک عام مسلمان اور ایک کمزور بندہ ہوں۔ صرف اللہ تعالیٰ کی مدد کا مجھے بھروسہ ہے۔ میں جس منصب پر مقرر کیا گیا ہوں، انشاء اللہ وہ میری طبیعت میں ذرہ برابر بھی تغیر پیدا نہیں کر سکے گا۔ بزرگی اور بڑائی جتنی کچھ بھی ہے سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے بندوں کے لئے اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ تم میں سے کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ عمر خلیفہ بن کے کچھ سے کچھ ہو گیا۔ میں اپنی ذات سے بھی حق وصول کروں گا اور جس معاملہ میں ضرورت ہوگی خود بڑھ کر صفائی پیش کرونگا۔ جس شخص کو کوئی ضرورت ہو یا جس پر کوئی ظلم ہوا ہو یا جو شخص میری کسی بات پر نکتہ چینی کرنی چاہتا ہو۔ وہ براہِ راست میرے پاس آئے، میں تمہارے ہی اندر کا ایک آدمی ہوں، تمہاری بہبود مجھے عزیز ہے، تمہاری خفگی مجھ پر گراں ہے اور جو امانت میرے سپرد کی گئی ہے مجھے اس کی جوابدہی کرنی ہے۔ جو معاملات میرے علم میں آئیں گے۔ میں ان کی براہِ راست تحقیق کروں گا۔ ان کو کسی اَور کے سر نہیں ڈالوں گا۔ البتہ جو معاملات مجھ سے دور ہیں۔ ان کے انتظام کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ میں ان کو تمہارے اندر سے ان لوگوں کے سپرد کروں جو قابل اعتماد اور عوام کے خیر خواہ ہوں۔ ایسے لوگوں کے سوا انشاء اللہ میں یہ امانت کسی اور کے سپرد نہیں کرونگا۔"

(الفاروق عمر صفحہ ۱۰۶)

نرمی، بردباری اور فیاضی حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی بہتری چاہتا ہے تو ان پر سنجیدہ

اور بردبار لوگوں کو حاکم بناتا ہے اور ان کا مال فیاض لوگوں کی تحویل میں دیتا ہے اور جب کسی قوم کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے۔ تو ان پر سفیہوں (بدھوؤں) کو مسلط کر دیتا ہے اور ان کا مال بخیلوں کے قبضہ میں دے دیتا ہے۔ آگاہ! جو شخص میری امت میں سے کسی منصب پر مامور ہوا (اور) اس نے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے میں نرمی سے کام لیا۔ اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت (قیامت) کے دن اس کے ساتھ نرمی برتے گا اور جو شخص لوگوں کی ضروریات کے درمیان اور اپنے درمیان حاجب و دربان کی دیوار کھڑی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے دن اس سے حجاب کرے گا"

خلیفہ ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے یہ دُعا فرمائی:-

"اے اللہ میں سخت دل ہوں مجھے نرم کر دے، میں کمزور ہوں مجھے مضبوط کر دے، میں بخیل ہوں مجھے سخی کر دے"

نکتہ چینی کی حوصلہ افزائی | اسلامی حکومت کے امراء و عمال کے لئے ضروری ہے۔ کہ ان کے اندر اس بات کی گہری خواہش موجود رہے کہ لوگ ان کی غلطیوں اور کمزوریوں پر ان کو ٹوکتے رہیں۔ اس چیز کو روکنے کے لئے لوگوں کو مختلف طریقوں اور "قوانین" (اگر اس غرض کے لئے اختیار کئے گئے ہتھکنڈوں کو کسی کے نزدیک قانون کا نام دیا جا سکتا ہو) کے ذریعے دہشت زدہ کرنے کے بجائے اُن پر لازم ہے کہ وہ اس کے لئے پبلک کو اکساتے رہنے کا سامان کریں۔ اسلامی نظام کو تنقید و احتساب سے کوئی خطرہ نہیں ہے اسکو اگر کوئی خطرہ ہے تو عوام کے اندر احتساب اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی رُوح مردہ ہو جانے سے ہے۔ اگر لوگوں کے اندر تنقید کی رُوح بیدار ہے اور وہ ہر چھوٹے اور بڑے کی غلطیوں پر ٹوکنے اور ان کا محاسبہ کرنے کی جرأت رکھتے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس نظام کے اندر زندگی کی رُوح موجود ہے اور یہ باقی رہے گا۔ ہاں اگر لوگوں کے اندر اس فرض کا احساس کمزور ہو رہا ہو۔ تو ارباب حل و عقد کا فرض ہے کہ فوراً چوکنے ہوں اور اس بیماری کو دور کرنے کی کوشش کریں کیونکہ یہ ہماری اسلامی ریاست کے لئے ایک واقعی خطرہ ہے اور اگر اس نے جڑ پکڑ لی تو پھر ریاست کی اسلامی خصوصیات کا باقی رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ اسلامی نظام کے لئے اس کی اسی اہمیت ہی کی وجہ سے اسلام نے غلطیوں پر ٹوکتے

رہنما اور ان سے متنبّہ کرتے رہنا افراد پر ان کے درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے فرض قرار دیا ہے۔ اور ان لوگوں کو سخت وعیدیں سنائی ہیں جو علم رکھتے ہوئے اِس فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی کریں کیونکہ یہ درحقیقت اسلامی ریاست کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی اور غدّاری ہے۔ حد یہ ہے کہ جو لوگ مسلمان سوسائٹی اور ان کے عمّال و امراء کو فاسقانہ اعمال کے مرتکب ہوتے اور غیر اسلامی راستوں پر جاتے دیکھیں اور علم رکھنے کے باوجود ان کو اس پر نہ ٹوکیں، انہیں "گونگے شیطان" قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی ریاست کے سب سے پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو سب سے پہلا خطبہ دیا اسی میں اس حقیقت کو واضح کر دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا:۔

"اے لوگو! میں تمہارا خلیفہ بنا دیا گیا ہوں . . . . . خدا کی قسم! میں نے اس منصب کی کبھی آرزو نہیں کی نہ رات میں اور نہ دن میں۔ اور نہ میں نے اس کے لئے کبھی دُعا کی، نہ پوشیدہ، نہ علانیہ۔ مجھ پر ایک بھاری ذمہ داری ڈال دی گئی ہے جس کے اُٹھانے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے لیکن اب اس سے مفر بھی نہیں ہے۔ میری دلی خواہش تھی کہ کاش میری جگہ اس کو کوئی ایسا شخص اٹھاتا جو ہم سب میں سب سے زیادہ مضبوط ہوتا۔ میں جب تک اللہ کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو۔ جب میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تمہارے اوپر میری اطاعت فرض نہیں ہے"

اس کے بعد روتے ہوئے فرمایا:۔

"اے لوگو! میں اس جگہ اس لئے نہیں مقرر کیا گیا ہوں کہ تم سب سے بہترین کے رہوں۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ کوئی اور اس جگہ کو سنبھالتا۔ اگر تم مجھے اس وحی کے پیمانہ سے ناپو گے جس سے اللہ اپنے رسول کو سیدھا رکھتا تھا تو تم مجھے اس کا سزاوار نہ پاؤ گے۔ میں تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ جب تم دیکھو کہ میں سیدھے راستہ پر چل رہا ہوں تو میری پیروی کرو اور اگر دیکھو کہ میں کج ہو گیا ہوں تو مجھے سیدھا کر دو"

(الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ جزء اوّل صفحہ ۱۶)

ایک مرتبہ لوگوں میں کچھ غلط فہمی پھیل گئی کہ آدمی پر صرف اس کے اپنے عمل کی ذمہ داری ہے۔ جماعت کے دوسرے لوگ جو چاہیں کرتے رہیں ان کی برائی اور بھلائی سے متعلق خدا کے ہاں اس سے

کوئی پرسش نہیں ہوگی۔ یہ لوگ قرآن مجید کی اس آیت سے دلیل پکڑتے تھے کہ "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ (اے ایمان والو تم اپنے آپ کو بچاؤ جو لوگ گمراہ ہیں ان کی گمراہی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی جب کہ تم خود ہدایت پر ہو) حضرت ابوبکرؓ کو جب لوگوں کی اس غلط فہمی کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس کو بڑی اہمیت کے ساتھ محسوس کیا اور خیال کیا کہ اگر یہ غلط فہمی عام ہوگئی تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وہ روح ہی لوگوں کے اندر مردہ ہوجائے گی جس کے بغیر اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام کا اپنی صحیح حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے چنانچہ انہوں نے فوراً اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے لوگوں کے سامنے ایک تقریر میں فرمایا۔

"اے لوگو! تم لوگ اس آیت کا حوالہ دیتے ہو، یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ الآیۃ اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے کہ لوگ جب برائی دیکھتے ہیں اور اس کی اصلاح نہیں کرتے تو بہت ممکن ہے کہ اس کے سبب سے جو عذاب آئے وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے[۱]"۔ (کتاب الخراج ص۸)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رعب و دبدبہ کس قدر مشہور عام چیز ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے لوگوں کی تنقیدوں کو جس کشادہ دلی کے ساتھ نہ صرف سنا ہے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے ہم ان مشہور واقعات کو جو عام طور پر لوگوں کی زبانوں پر ہیں نظر انداز کر کے اس بارہ

۱ھ راوی نے صرف خطبہ کی ایک بات نقل کی ہے۔ ظاہر ہے کہ خطبہ صرف اسی قدر نہیں ہوگا بلکہ حضرت ابوبکرؓ نے آیت کا موقع و محل اور اس کا صحیح مفہوم تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہوگا۔

قرآن شریف میں یہ آیت اس موقعہ پر ہے جہاں مسلمانوں کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ داعیانِ حق پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کس حد تک ذمہ داری ڈالی گئی ہے، اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ان پر صرف حق کو پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، اگر انہوں نے یہ ذمہ داری ادا کر دی تو وہ اپنے فرض سے سبکدوش اور خدا کے مواخذہ سے بری ہوگئے۔ اس کے بعد حق کو قبول کرنا یا نہ کرنا دوسروں کا کام ہے۔ اور قیامت کے دن اس کا مواخذہ انہی سے ہوگا۔ داعیانِ حق سے اس بات کی کوئی پرسش نہیں ہوگی کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لائے۔

میں ان کی بعض ایسی ہدایات نقل کرتے ہیں جو عام طور پر لوگوں کے علم میں نہیں ہیں:۔

حضرت حسن بصری سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے کہا، اے عمر! اللہ سے ڈرو اور اس جملہ کو بار بار دہرایا۔ ایک دوسرے شخص نے اس کو ٹوکا کہ اب بس بھی کرو، بہت ہو چکا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، ان کو کہنے دو۔ اگر یہ ہم کو یہ باتیں نہ کہیں تو ان میں کوئی خوبی نہیں اور اگر ہم ان کی ان نصیحتوں کو قبول نہ کریں تو ہم میں کوئی خوبی نہیں ہے۔" (کتاب الخراج ص۷)

ایک دفعہ رعایا کے حقوق و فرائض کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا

"اور تم میرے نفس کے مقابلہ میں میری مدد اس طرح کر سکتے ہو کہ مجھے بھلائی کا حکم دو۔ اور برائی سے روکو۔ خدا نے تمہاری جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے۔ اس کے بارہ میں میری خیرخواہی (مجھے نصیحت) کرتے رہو۔"

(الفاروق عمر ص۹۶)

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ارشاد فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ خواص کی بدکاریوں کی پاداش میں عوام کو نہیں پکڑا کرتا۔ مگر جب برائیاں کھلم کھلا ہونے لگتی ہیں اور ان کے خلاف آواز نہیں اٹھتی تو سب سزا کے مستحق قرار پاتے ہیں۔" (کتاب الخراج ص۸)

رعایا کی خیرخواہی اور ان کے حال پر شفقت

"معقل بن یسار سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کا چرواہا (حاکم) بنایا۔ اور وہ اس حال میں مرا کہ اس نے لوگوں کی بدخواہی کی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دے گا۔" (متفق علیہ)

یہی روایت دوسرے الفاظ میں یوں بیان کی گئی ہے:۔

"جو شخص مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار بنایا جائے۔ پھر نہ تو وہ ان کے لئے کوشش کرے اور نہ ان کی خیرخواہی کرے تو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔" (مسلم)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا کہ اے اللہ جو شخص میری امت کے لوگوں کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنایا جائے۔ اور وہ ان کو مشقت

میں ڈالے تو تو بھی اس کو مشقت میں ڈال۔ اور جو شخص میری امت کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنایا گیا اور اس نے ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا تو تو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کر۔" (احمد و مسلم)

جہالت اور طیش مزاجی سے احتراز

ابو اسامہ ہذلی سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تمہارے اوپر ہمارا حق ہے کہ تم پیٹھ پیچھے ہماری خیر خواہی کرو اور بھلائی کے کاموں میں ہماری مدد کرو۔"

اس کے بعد حکام اور امراء سے خطاب کر کے فرمایا:-

"ایک افسر اور حاکم کی بردباری سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو کسی کی بھی بردباری اور نرمی پسند نہیں ہے اور نہ اس کی بردباری اور نرمی سے زیادہ کسی کی بردباری اور نرمی کا فائدہ وسیع اور عام ہے۔ اسی طرح ایک حاکم اور افسر کی طیش مزاجی اور جہالت سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی کی طیش مزاجی اور جہالت مبغوض نہیں ہے اور نہ اس کی طیش مزاجی اور جہالت سے زیادہ کسی کی جہالت اور طیش مزاجی کا ضرر عام ہے جو شخص لوگوں کے درمیان سلامتی کی روش اختیار کرتا ہے۔ وہ اوپر اللہ تعالیٰ اسے سلامتی اور عافیت کا انعام پاتا ہے:" (کتاب الخراج۔ قاضی ابو یوسفؒ)

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ "زاد المعاد" میں آیت "خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ"[1] کے اسرار پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس آیت میں حکمرانوں کے تمام مکارم اخلاق اور اچھے اوصاف جمع کر دیئے گئے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک حکمران کو اس کی رعیت سے متعلق تین طرح کی حالتیں پیش آسکتی ہیں۔ ایک تو اس کا وہ حق ہے جو ان پر عائد ہوتا ہے اور جو لازماً ان کو ادا کرنا ہے دوسرے وہ حکم ہے جو اس کو دینا ہے۔ تیسرے وہ کوتاہی جو رعایا سے صادر ہو سکتی ہے۔ پہلے کے بارہ میں (اس آیت میں) ان کو حکم دیا کہ جو کچھ رعایا آسانی کے ساتھ برضا و رغبت ادا کرے اور جو اس کے لئے بار نہ ہو اس کو قبول کر لے۔ عفو کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ جس کا ادا کرنا رعایا کے لئے شاق نہ ہو۔ دوسرے کے بارے میں فرمایا کہ ان کو عرف کا حکم دے۔ عرف سے مراد معروف

---

[1] عفو اختیار کر، معروف کا حکم دے اور جاہلوں سے اعراض کر۔

ہے یعنی وہ بات جس کو عقلِ سلیم اور فطرتِ سلیم تسلیم کرتی ہے اور جس کے نافع ہونے پر رعایا کو اطمینان ہے۔

پھر فرمایا کہ جب اس کا حکم دے تو حکم دینے کا انداز بھی معروف ہو یعنی سختی اور درشتی کا انداز نہ ہو اور جو لوگ جہالت اور بدتمیزی سے پیش آئیں، ان کے شر کا جواب شر سے دینے کے بجائے ان سے چشم پوشی کرے"۔

(زاد المعاد جلد ۲ صفحہ ۱۱۵)

ہمیشہ حق کے راستہ کا انتخاب | قاضی ابو یوسف صاحب نے ہارون الرشید کو مندرجہ ذیل ہدایت فرمائی:۔

"حکام کو اپنے رب کے حضور اسی طرح جوابدہی کرنی پڑے گی جس طرح ایک چرواہے کو اپنے آقا کے سامنے کرنی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالی ہے اس میں حق قائم کیجئے، اگرچہ ایک ہی گھنٹہ کے لئے ممکن ہو خوش قسمت امیر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہوگا جس کی رعایا اس کے سبب سے خوشحال ہو"

"اور آپ حق سے نہ ہٹیئے کہ آپ کی رعایا بھی حق سے ہٹ جائے۔ خواہش کے مطابق حکم دینے اور غصہ میں مواخذہ کرنے سے بچیئے۔ جب آپ کے سامنے دو راہیں ہوں، ایک دنیا کی اور دوسری آخرت کی تو دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی راہ اختیار کیجئے ......"

"اللہ کے معاملہ میں اور خدا کے قانون کے جاری کرنے کے بارہ میں یگانے اور بیگانے سب کو کوئی فرق نہ کیجئے اور اس کے معاملہ میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہ کیجئے۔ اللہ سے برابر ڈرتے رہیئے اور ڈرنا دل سے ہوتا ہے، نہ زبان سے۔ تقویٰ اختیار کیجئے اور تقویٰ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کا نام ہے۔ اور جو شخص بچنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بچاتا بھی ہے"۔ (کتاب الخراج صفحہ ۲)

صرف اللہ سے رہنمائی کی طلب | اسی سلسلہ میں قاضی صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"اور میں آپ کو اے امیر المومنین اس بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو امانت آپ کی حفاظت میں دی ہے اس کی حفاظت کیجئے اور جس چیز کی نگرانی کا بوجھ آپ پر ڈالا ہے اس کو پوری ذمہ داری کے ساتھ اٹھائیے اور اس معاملہ میں امداد اور رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف نہ دیکھیئے۔ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے امداد و رہنمائی حاصل کرنا چاہیں گے تو ہدایت کی سہل راہ آپ کے لئے دشوار گذار بن جائے گی، اور اس کے نشانات آپ کی

نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے، اس کی کشادگی آپ پر تنگ کر دی جائے گی، اس کا منکر معروف بن جائے گا۔ اور معروف منکر بن جائے گا ...... ہر آدمی سے اس نقصان کے بابت باز پرس ہوگی جو اس کے سپرد کئے ہوئے گلہ میں واقع ہوگا کیونکہ اگر وہ چاہتا تو اس کو تباہی کے مواقع سے دور رکھ کر، اللہ کے حکم سے اس کو نقصان سے بچا سکتا تھا۔ اور اس کو زندگی اور نجات کے راستہ پر لا سکتا تھا۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کی طلب چھوڑ دیگا تو اللہ تعالیٰ اس کو چھوڑ دیگا اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے رہنمائی اور الہام حاصل کریگا تو یہ تباہی پوری تیزی کے ساتھ آئے گی۔ اور اگر اس نے اصلاح کی تو آخرت میں اس کی کامیابی اور خوشحالی اس سے کہیں زیادہ ہوگی جتنی آج ہے اور اس نے اللہ کے ساتھ جو وفاداری کی ہے اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ اس سے کہیں زیادہ عطا فرمائے گا جتنی اس نے وفاداری کی ہے۔ پس آپ اس بات سے بچیئے کہ آپ اپنی رعایا کو ضائع کریں اور اللہ تعالیٰ ان کا حق آپ سے وصول کرے اور چونکہ آپ نے اپنا اجر ضائع کر دیا اس لئے وہ بھی آپ کو ضائع کردے۔ یاد رکھیئے کہ عمارت کو سہارا دینے کی فکر اس کے گرنے سے پہلے کی جاتی ہے۔ جن لوگوں کی سربراہ کاری اور حفاظت کا بار اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالا ہے آپ جو کچھ ان کے لئے کریں گے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا صلہ پائیں گے اور ان کے جو حقوق آپ ضائع کریں گے اس کا وبال آپ پر آئے گا پس ان لوگوں کے فرائض کو نہ بھولئے جن کا بار خدا نے آپ پر ڈالا ہے وہ بھی آپکو نہیں بھولے گا۔ آپ ان کے حقوق اور ان کی بہبود سے غافل نہ ہوں، اللہ بھی آپ سے غافل نہ ہوگا" (کتاب الخراج ص۱۲)

تمسک بالکتاب والسنۃ حکمرانی کی ذمہ داریاں سر پر آجانے کے بعد آدمی کو راہ حق پر استوار رکھنے کے لئے جو چیزیں سب سے زیادہ ضروری ہیں ان کی طرف ہارون الرشید کی توجہ دلاتے ہوئے قاضی ابو یوسف صاحب ؒ مذکورہ بالا سلسلہ میں فرماتے ہیں[1]:۔

---

[1] ان نصیحتوں کو پڑھتے وقت یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ یہ نصیحتیں کسی تنگ خیال مذہبی ملا کی نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے شخص کی ہیں جو اپنے زمانہ کی سب سے بڑی اور ترقی یافتہ سلطنت کا قاضی القضاۃ (Chief Justice) اور علمی و عملی سیاست کا سب سے بڑا ماہر تھا، اور جس شخص کو یہ نصیحتیں کی جا رہی ہیں وہ بھی کوئی معمولی درجہ کا آدمی نہیں ہے۔ بلکہ اپنے عہد کا اتنا بڑا حکمران تھا کہ یورپ کے بڑے بڑے سلاطین کو نہایت حقارت کے ساتھ مخاطب کیا کرتا تھا۔

"ان تمام میں جو چیز بچو اس دنیا کے حاصل حقیقی کے ضائع کرنے سے بچا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے دل میں کثرت کے ساتھ اللہ کی حمد و تسبیح کیجئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر درود بھیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت اور اپنی مہربانی سے اصحاب حکومت کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور ان کے درمیان ایک روشنی (قرآن مجید) نازل کی ہے جو رعایا کی تمام نزاعی امور کا تصفیہ اور تمام مشتبہ حقوق کا فیصلہ کرتی ہے۔ امراء اور خلفاء کی طرف سے اس نور کا روشن رکھنا یہ ہے کہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے حدود قائم کئے جائیں اور اہل حق کے حقوق پورے انصاف اور قوت کے ساتھ ادا کئے جائیں۔ اور صالحین نے جو سنت قائم کی ہے اس کو زندہ رکھنا سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ پیش نظر ہونا چاہیئے کیونکہ صالحین کے طریقوں کو زندہ رکھنا ان بھلائیوں میں سے ہے جو ہمیشہ زندہ رہتی ہیں کبھی مرتی نہیں ہیں حکمران کا ظلم عوام کی تباہی ہے اور اس حکمرانی کے کام میں ایسے لوگوں کو شریک بنانا جو اچھے اور قابل اعتماد نہیں ہیں عوام کی اور زیادہ تباہی ہے۔ اس نعمت کا صحیح طور پر حق اور اس کا پورا پورا شکر ادا کرنے کی کوشش کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو آپ کے لئے کامل کرے جیسا کہ اس نے اپنی کتاب عزیز میں فرمایا ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہاری نعمت کو زیادہ کروں گا)۔ صلاح سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو کوئی چیز پسند نہیں ہے اور نہ فساد سے زیادہ کوئی چیز ناپسند ہے۔ اور خدا کے احکام کی خلاف ورزی اس کی نعمتوں کی ناشکری ہے اور جو قوم اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتی ہے اور پھر جلد توبہ کے ذریعہ اصلاح حال کی کوشش نہیں کرتی اللہ تعالیٰ اس سے اپنی بخشی ہوئی عزت چھین لیتا ہے۔" (کتاب الخراج صہ)

تواضع یعنی مصنوعی کرّوفر سے پرہیز

اسلامی حکومت کے امراء و عمال کے لئے اصلی عزت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے واسطہ سے ان کو حاصل ہوئی ہو اور یہی حقیقی عزت ہے اس وجہ سے اس عزت کے سوا کسی اور عزت کا نہ ان کے دلوں میں رمان ہونا چاہیئے اور نہ دین اور اطاعت الٰہی کے سوا عزت حاصل کرنے کا کوئی اور راستہ انہیں اختیار کرنا چاہیئے۔ عزت حاصل کرنے کے وہ تمام جھوٹے طریقے جو دنیا پرست اور جاہ پسند ارباب اقتدار نے اختیار رکھے ہیں مثلاً آداب و کورنش، شاہانہ جلوس، درباری طمطراق، ہٹو بچو، توپوں کی سلامی، باڈی گارڈز کی نمائش، گارڈ آف آنر اور اس قسم

کے دوسرے مظاہرے بسب عبدیت اور خدا پرستی کی رُوح کے منافی اور انسان کے استکبار اور اس کے دعویٰ خدائی کی نشانیاں ہیں، اس وجہ سے اسلامی نظامِ زندگی سے یہ چیزیں بالکل بے جوڑ ہیں اور جو لوگ اس مفروضہ پر ان چیزوں کو اختیار کرتے ہیں کہ ان سے دین کی شان میں اضافہ ہوتا ہے وہ دراصل اپنے کبرِ نفس کو چھپانے کے لئے دین کو پردہ بناتے ہیں۔ ورنہ جہاں یہ فتنے موجود ہوں وہاں دین بیچارے کا کیا کام!

حضرت عمرؓ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو نہ کوئی دربار سجایا گیا، نہ جلوس نکالا گیا، نہ جھنڈے لہرائے گئے اور نہ سلامیاں پیش کی گئیں۔ البتہ حضرت علیؓ نے ان کو مندرجہ ذیل نصیحتیں فرمائیں جو آج تک اوراقِ تاریخ میں ثبت ہیں اور حضرت عمرؓ نے ان نصیحتوں پر جس طرح عمل کیا، اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم پر روشن ہے :-

"اگر آپ اپنے پیشرو کی جگہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو قمیص میں پیوند لگا لیجئے۔ تہبند اونچی کیجئے جُوتے اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیجئے۔ جرابوں میں پیوند لگائیے۔ امان کم کیجئے اور بھوک سے کم کھائیے"۔

(کتاب الخراج صہ ۹)

ان نمائشوں سے اگر دین کی دھاک قائم ہو سکتی تو اس مصلحت کے لحاظ سے اس سے زیادہ موزوں بلکہ ضروری وقت اور کون ہو سکتا تھا جب حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کا سفر فرمایا تھا؟ ملک ابھی تازہ تازہ فتح ہوا تھا اور اہلِ ملک رومیوں کے جاہ وجلال کے دیکھنے کے عادی تھے لیکن حضرت عمرؓ نے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اور یہ نہیں کہ اپنی طبعی سادگی کی بنا پر اتفاقیہ اس کی پرواہ نہیں کی بلکہ لوگوں نے بڑے زور وقوت کے ساتھ وقت کی مصلحت ان کو سمجھانے کی بھی کوشش کی، لیکن انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی اور اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا کہ دین کی عزت کے سوا جو لوگ کسی اور عزت کے طالب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ذلیل کر دیتا ہے۔ اب مؤرخین کے حسب ذیل بیان میں ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت عمرؓ کا یہ سفر کس شان کے ساتھ ہوتا ہے اور جب لوگ ان کو مشورے دیتے ہیں کہ وہ وقت کی مصلحتوں کا لحاظ فرمائیں تو وہ کیا جواب دیتے ہیں[1] :-

[1] یہ واقعات محمد حسین ہیکل کی کتاب "الفاروق عمرؓ" صفحہ ۱۴۷ سے لئے گئے ہیں

"حضرت عمرؓ جب مدینہ سے جابیہ کو روانہ ہوئے تو ایک اونٹ پر روانہ ہوئے۔ ساتھ دو تھیلے تھے۔ ایک میں ستو تھے اور دوسرے میں کھجوریں۔ سامنے پانی کی مشک تھی اور پیچھے توشہ دان۔ صحابہ کی ایک جماعت بھی ساتھ تھی، جب کھانے کا وقت ہوتا، آپ اپنا توشہ دان پیش کرتے اور سب لوگ آپ کے ساتھ ہی کھانا کھاتے، ساتھ ساتھ تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ سفر میں جہاں ایسے مسلمان نظر پڑ جاتے جو دین سے ناواقف نظر آتے حضرت عمرؓ ان کو دین کی باتیں بتاتے۔ جب شام کے قریب پہنچے تو کچھ سوار نظر آئے۔ جن کو ابو عبیدہ نے خبر لینے کے لیے بھیجا تھا۔ بیت المقدس میں داخل ہوتے وقت حضرت عمرؓ کے جسم پر جو کپڑا تھا اس میں چودہ پیوند لگے ہوئے تھے، جن میں بعض پیوند چمڑے کے تھے۔ آپ کے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ اس موقع پر اونٹ کی بجائے گھوڑے کی سواری موزوں رہے گی، اور کپڑے بھی سفید پہن لیجئے۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے اصرار پر کپڑے بدل لئے اور کندھے پر ابو عبیدہ کا پیش کیا ہوا کتان کا ایک رومال بھی ڈال لیا۔ پھر ایک اسپ تازی لایا گیا اور آپ اس پر سوار ہوئے لیکن جب وہ اچھلتا ہوا چلا تو فوراً اتر پڑے اور ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: "مسلمانو! میری غلطی معاف کرنا۔ قریب تھا کہ تمہارا امیر ہلاک (DAMN) ہو جائے۔ اس سروسامان نے میرے دل میں عجیب غرور پیدا کر دیا تھا۔ اس کے بعد فوراً یہ نئے کپڑے بھی اتار پھینکے اور اپنے پیوند لگے ہوئے کپڑے پہن لئے۔"

ابن کثیر نے اس سفر کی تصویر اس طرح کھینچی ہے:-

"عمر ابن الخطاب ایلیہ کے راستہ سے جابیہ ایک سفید اونٹ پر تشریف لائے۔ دھوپ ان کی پیشانی پر پڑ رہی تھی، سر پہ نہ ٹوپی تھی، نہ عمامہ، کجاوہ کے دونوں طرف پاؤں بغیر رکاب کے لٹک رہے تھے۔ ایک کمبل تھا اترتے تو اس سے بستر کا کام لیتے اور سوار ہوتے تو اس کو کجاوہ پر ڈال لیتے۔ کھدر کی قمیص پہنے ہوئے تھے جو پرانی ہو کر دونوں پہلوؤں سے پھٹ چکی تھی۔ پہنچتے ہی فرمایا، قوم کے سردار کو بلاؤ۔ لوگوں نے پادری کو بلایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا: میری یہ قمیص دھو کر سی دو اور ایک کپڑا یا قمیص مجھے مستعار دو۔ وہ ایک کتان کی قمیص لایا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیا کپڑا ہے؟ اس نے کہا، کتان۔ فرمایا۔ کتان کیا چیز ہے؟ اس نے اس کی حقیقت بتائی، اس کے بعد آپ نے اپنی قمیص اتار دی۔ وہ اسے دھو کر اور پیوند لگا کر لایا۔ آپ نے اپنی

قمیص پہن لی اور اس کی قمیص اتار دی۔ پادری نے کہا، آپ عرب کے بادشاہ ہیں اور یہ ملک اونٹ کی سواری کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اس وجہ سے اگر آپ لباس بدل لیتے اور گھوڑے پر سوار ہوتے تو رومیوں کی نظر میں اس کی وقعت ہوتی، حضرت عمرؓ نے اس کو جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو عزت بخشی ہے وہ اسلام کے ذریعہ سے بخشی ہے۔ اور ہم اسلام کے سوا کسی اور چیز کو ذریعۂ عزت بنانا نہیں چاہتے۔ اس کے بعد ایک اسپ تازی لایا گیا جس پر بغیر کاٹھی اور زین کے محض ایک معمولی سا کوئی کپڑا ڈال کر سوار ہوئے لیکن ابھی سوار ہوتے ہی تھے، کہ فرمایا، روکو، روکو۔ میں نے اس سے پہلے شیطان پر سوار ہوتے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ کہہ کے اتر پڑے، اس کے بعد ان کا اونٹ لایا گیا اور اس پر سوار ہوئے۔"

ابن کثیر نے اس سفر کے سلسلہ کا ایک اور واقعہ بھی نقل کیا ہے جو سننے کے قابل ہے:۔

"طارق ابن شہاب سے روایت ہے کہ شام کے سفر کے دوران میں حضرت عمرؓ کو راستہ میں ایک جگہ پانی عبور کرنا پڑا، بے تکلف اونٹ سے اترے، چمڑے موزے اتار کر ہاتھ میں لئے، اونٹ کی نکیل پکڑی اور پانی میں گھس گئے، سپہ سالار فوج ابو عبیدہ ساتھ تھے، یہ ماجرا دیکھ کر بولے، امیر المومنین، یہاں کے لوگ آپ کی اس بات کو دیکھ کر بڑا تعجب کریں گے، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا، ابو عبیدہ، کاش یہ بات تمہارے سوا کوئی اور کہتا، کیا تمہیں معلوم نہیں۔ کہ ہم سے زیادہ ذلیل، ہم سے زیادہ حقیر اور ہم سے زیادہ کم تعداد کوئی اور قوم دنیا میں نہ تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم کو اسلام کے ذریعہ سے عزت دی۔ تو یاد رکھو کہ اگر تم اسلام کی بخشی ہوئی عزت کے سوا اور کوئی عزت حاصل کرنا چاہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ذلیل کردے گا۔"

یہ اس شخص کے اپنے مفتوحہ علاقہ کے سفر کی شان ہے جس کی فاتح فوجیں عرب سے نکل کر مشرق میں افغانستان اور چین کے حدود تک، شمال میں اناطولیہ اور بحر قزوین (CASPIAN SEA-) تک، مغرب میں ٹیونس تک اور جنوب میں ملک حبش تک پہنچ چکی تھیں اور جس نے قیصر و کسریٰ کی ساری شان خاک میں ملا دی تھی!

حضرت عمرؓ نے یہی روش خود بھی اور اسی پر اپنے عمال اور افسران اور عام مسلمانوں کو قائم رکھا اور اگر کسی افسر کے متعلق ان کو پتہ چلا، کہ اس نے کوئی بات اس روش کے خلاف کی ہے تو اس پر پوری شدت کے ساتھ گرفت کی اور اس معاملہ میں کسی کی بڑائی کی پرواہ نہ کی اور نہ کسی مصلحت کا لحاظ کیا۔

حضرت سعد (کوفہ کے امیر) کے متعلق یہ اطلاع ملی کہ:-

انہوں نے ایک محل بنوایا ہے حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو کوفہ بھیجا کہ جا کر محل کے دروازے کو جلا دو۔ اور الٹے پاؤں واپس آؤ۔ ابن مسلمہ کوفہ پہنچے۔ سعد کو معلوم ہوا تو انہوں نے ان کو محل کے اندر بلوایا لیکن انہوں نے محل کے اندر داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ خود باہر نکلے اور چاہا کہ ان کی کچھ میزبانی کریں لیکن انہوں نے اس کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ان کو حضرت عمرؓ کا خط دیا۔ جس کا مضمون یہ تھا:-

"مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے ایک محل بنوایا ہے جو ایک پورا قلعہ ہے اور اس کو قصر سعد کہا جاتا ہے اور تم نے اپنے اور لوگوں کے درمیان ایک دروازہ قائم کر دیا ہے۔ یہ تمہارا محل نہیں ہے۔ بلکہ فساد اور تباہی کا گھر ہے۔ تم اس کے ایک حصہ میں جو بیت المال سے متصل ہے۔ قیام کرو اور بقیہ کو بند کر دو۔ اور کوئی ایسا دروازہ نہ رکھو جو لوگوں کو تمہارے پاس پہنچنے سے روکے اور ان کو ان کے حقوق سے محروم کرے ایسا کرو کہ لوگ ہر حالت میں تم سے مل سکیں"

اس خط کو پڑھنے کے بعد انہوں نے قاصد کو تمام صورت حال سے اچھی طرح آگاہ کیا۔ اور اس کو پوری طرح مطمئن کر کے واپس بھیجا۔"

یہی کفایت شعاری اور سادگی وہ عام مسلمانوں کی زندگیوں میں بھی نمایاں دیکھنا چاہتے تھے، اور اسی چیز کو سنت کی پیروی اور اسی پر سلطنت کے بقا کا انحصار سمجھتے تھے، چنانچہ کوفہ کی تعمیر کے وقت مسلمانوں کو حکم دیا۔ کہ کوئی شخص تین کمروں سے زیادہ نہ بنائے۔ اور نہ کوئی شخص اونچی عمارت بنوائے۔ اور فرمایا کہ:-

"سنت پر قائم رہو، تمہاری یہ سلطنت بھی قائم رہے گی۔"

رعایا کی خبر گیری اور ان کے دکھ درد میں شرکت

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ رعایا کے حقوق کی تصریح کرتے ہوئے اپنے اوپر رعایا کے مندرجہ ذیل حقوق بیان فرمائے:-

لکم علی ألا اجتبی شیئا من خراجکم	تمہارا میرے اوپر یہ حق ہے کہ میں تمہارے خراج اور
ولا ما افاء الله علیکم الا من وجهه	فے میں سے کوئی چیز ناجائز طریقہ سے حاصل نہ کروں
ولکم علی اذا وقع فی یدی ألا	اور تمہارا میرے اوپر یہ بھی حق ہے کہ جب وہ میری

يخرج إلا في حقه ولكم	تحویل میں آجائے تو وہ صرف صحیح مصرف میں خرچ
على ان ازيد عطايا كم	ہو اور تمہارا میرے اوپر یہ بھی حق ہے کہ میں تمہارے وظائف
وارزاقكم ان شاء الله واسد	اور روزینوں میں اضافہ کروں اور تمہاری سرحدوں کی
ثغوركم. ولكم على الا القيكم	حفاظت کروں۔ اور تمہارا میرے اوپر یہ بھی حق ہے کہ
في المهالك ولا اجمركم	میں تم کو خطرات میں نہ ڈالوں اور نہ تم کو بلا ارادہ تمہارے
في ثغوركم اذا غبتم	بیوی بچوں سے الگ کر کے سرحدوں پر محصور رکھوں
في البعوث فانا ابو العيال۔	اور پھر تمہارا میرے اوپر یہ بھی حق ہے کہ جب تم
	جہات کے سلسلہ میں (اپنے بچوں سے) دور ہو تو میں

ان بچوں کا باپ ہوں۔"

اس موقعہ پر ہم ان تمام حقوق سے صرف آخری حق کے متعلق حضرت عمرؓ کی زندگی کے بعض واقعات پیش کرتے ہیں تاکہ واضح ہو سکے کہ رعایا کے باپ بننے کے معنی فی الواقع کیا ہیں؟ دنیا میں اس کا دعویٰ کرنیوالوں کی کمی نہیں رہی ہے، حکمرانی کی باگ جن ہاتھوں میں بھی آئی ہے، انہوں نے اپنے آپکو ہمیشہ اسی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور اسی حیثیت سے لوگوں سے اپنے واجبی حقوق سے کہیں زیادہ حقوق بھی وصول کئے ہیں۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ جنہوں نے رعایا کے باپ ہونے کے دعوے کئے ہوں، انہوں نے باپ کے فرائض بھی ادا کئے ہوں۔ اس وجہ سے اگرچہ نظری طور پر اس امر سے کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ کہ حکومت کے ارباب حل وعقد رعایا کے باپ ہوتے ہیں لیکن عملی طور پر لوگ اس حقیقت سے بھی بالکل ناآشنا ہیں۔ ہم اس حقیقت کو معین عملی مثالوں سے واضح کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ایک صحیح اسلامی ریاست کے اندر یہ نظریہ عمل میں کس طرح نمایاں ہوگا۔

(۱) ایک شب میں حضرت عمرؓ اپنے غلام اسلم کو ساتھ لے کر مدینہ سے باہر نکل گئے۔ ایک خیمہ نظر پڑا تو ادھر کو مڑ گئے۔ قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک عورت دردِ زہ میں مبتلا ہے اور تکلیف سے تڑپ رہی ہے حضرت عمرؓ نے اس سے حال دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ میں ایک بدوی عورت ہوں۔ اور میرے پاس اسوقت

کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو اس موقع پر کام آسکے۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر بھاگے ہوئے گھر آئے اور اپنی بیوی ام کلثوم بنت ابی طالب سے فرمایا، اللہ کی مہربانی سے ثواب حاصل کرنے کا ایک عمدہ موقع نکل آیا ہے کیا اس کے لئے تیار ہو؟ اس کے بعد واقعہ کی پوری تفصیل ان کو سنائی۔ وہ اس خدمت کے لئے فوراً تیار ہوگئیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی پیٹھ پر آٹے کی بوری لادی اور کچھ روغن ساتھ لیا اور ام کلثوم نے وہ ضروری چیزیں ساتھ لیں، جو ولادت کے سلسلہ میں کام آتی ہیں اور میاں بیوی فوراً بدو کے خیمہ کے پاس پہنچ گئے ام کلثوم خیمہ کے اندر چلی گئیں اور حضرت عمرؓ خیمہ کے باہر بیٹھ کر بدو سے باتیں کرنے لگے۔ غریب بدو کو کچھ پتہ نہیں کہ وہ اس وقت کس سے ہم کلام ہے۔ اتنے میں اندر سے حضرت ام کلثوم نے فرمایا کہ امیر المومنین اپنے ساتھی کو فرزند کی بشارت دیجئے۔ اب بدو کو پتہ چلا کہ یہ امیر المومنین ہیں۔ وہ ششدر رہ گیا اور معذرت کرنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو تسلی دی اور ضرورت کی چیزیں دے کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

(۳) ایک روز رات کو گشت میں حضرت عمرؓ نے کسی بچہ کے رونے کی آواز سنی، اس کی ماں کو مخاطب کرکے فرمایا، اے عورت، اللہ سے ڈر، اور اس بچہ سے اچھا سلوک کر۔ تھوڑی دیر کے بعد اس بچہ کے رونے کی آواز پھر کانوں میں آئی۔ انہوں نے اس کی ماں کو مخاطب کرکے پھر دہی بات فرمائی۔ شب کے آخری حصہ میں بچہ پھر روتا ہوا معلوم ہوا۔ اب کے حضرت عمرؓ نے قریب ہوکر غصہ کے ساتھ فرمایا، تو کتنی بری ماں ہے۔ تیرے بچہ نے رات بھر دم نہیں لیا! عورت نے جواب دیا، میں اس کا دودھ چھڑا رہی ہوں۔ مگر یہ مانتا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا، تو اس کا دودھ کیوں چھڑا رہی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ دودھ اس لئے چھڑا رہی ہوں کہ جب تک بچہ دودھ نہیں چھوڑتا اس وقت تک عمرؓ اس کا وظیفہ نہیں مقرر کرتا۔ پوچھا تیرے بچہ کی عمر کیا ہے؟ اس نے کہا۔ اتنے مہینے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا، تیرا برا ہو اس قدر جلد بازی نہ کر، اس کے بعد صبح کی نماز سے فارغ ہوکر مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور آبدیدہ ہوکر فرمایا: "ہائے عمر کی بدبختی، اس نے مسلمانوں کے کتنے بچوں کو ہلاک کیا!" اس کے بعد فوراً اپنے منادی سے اعلان کرادیا۔ کہ لوگ اپنے بچوں کے دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کریں۔ اب ہر بچہ کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا ہے۔[۱]

۱ الفاروق عمر جلد دوم ص

(۳) ایک روز حضرت عمرؓ شب میں گشت کرتے ہوئے کسی جگہ پہنچے۔ دیکھا کہ ایک ہانڈی آگ پر رکھی ہوئی ہے۔ ایک عورت پاس بیٹھی ہے اور اس کے بچے رو رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے عورت سے دریافت کیا۔ یہ بچے رو کیوں رہے ہیں؟ اور یہ آگ پر کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا یہ بھوکے ہیں اور میں نے انکو بہلانے کے لئے آگ پر پانی رکھ دیا ہے کہ یہ بہل کر سو جائیں۔ میرے اور عمرؓ کے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر فوراً چلے گئے ہوئے بیت المال پہنچے۔ وہاں سے آٹے کی بوری پیٹھ پر لادی اور اس کو لے کر اس عورت کے پاس پہنچے۔ خود بیٹھ کر آگ پھونکی جب کھانا تیار ہو گیا اور بچے کھا پی کر سو گئے۔ تب وہاں سے اٹھے اور بار بار یہ فقرہ تاثر کے ساتھ دہراتے تھے کہ "یہ بچے بھوک سے رو رہے تھے اور بھوک کے سبب سے جاگ رہے تھے"۔[1]

عمال کا احتساب اسلامی نظام میں احتساب یعنی اپنے ماتحتوں کے کاموں کی بے لاگ نگرانی اور ان کی کوتاہیوں اور زیادتیوں پر مواخذہ ان فرائض میں سے ہے جن سے غفلت کرنے والا اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق قرار پاتا ہے، کیونکہ اس چیز میں کوتاہی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ پورے نظام میں فساد پھیل جاتا ہے اور بالآخر ایک دن پورا نظام درہم برہم ہو کے رہ جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ کسی عامل کو کسی عہدہ پر مقرر کرنے سے پہلے اس کی مالی حالت کا اچھی طرح اندازہ کر لیتے۔ اس کے بعد اس بات کی نگرانی کرتے کہ اس عہدہ کے دوران میں اس کی آمدنی کے اضافہ کا کیا حال رہا ہے۔ اگر یہ اضافہ اس کی سابقہ آمدنی اور اس کے عہدہ کی آمدنی کے [illegible] تو اس سے تعرض نہ فرماتے۔ لیکن اگر ان کو اس میں کوئی غیر معمولی فرق محسوس ہوتا تو فوراً تحقیقات شروع کر دیتے اور اگر تحقیقات سے خیانت ثابت ہوتی تو اس کی آمدنی تقسیم کرا لیتے اور فرماتے کہ ہم نے تم کو والی بنا کر بھیجا ہے۔ تاجر بنا کر نہیں بھیجا ہے۔

مصر کے گورنر عمرو بن عاص کے متعلق حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ انہوں نے وافر سامان بہت اکٹھا کر لیا ہے یہ معلوم ہوتے ہی فوراً انکو لکھا کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے پاس سامان، غلام، برتن، مویشی اور اس

[1] الفاروق حصہ دوم ص ۲۱۶

قسم کی دوسری چیزیں بہت جمع ہوگئی ہیں۔ حالانکہ تم مصر کے گورنر مقرر کئے گئے تھے۔ تو ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی تمہارے پاس موجود نہ تھی۔" عمرو بن عاص نے جواب دیا کہ "یہ زراعت اور تجارت کا ملک ہے اس وجہ سے ہم کو ہماری ضرورت سے زیادہ بچ جایا کرتا ہے اور ہم آسانی کے ساتھ پس انداز کر لیتے ہیں" حضرت عمرؓ نے ان کو جواب میں لکھا کہ "میں بُرے عاملوں کا کافی تجربہ رکھتا ہوں، تمہارا خط بتاتا ہے۔ کہ تمہارے اوپر جو گرفت کی گئی ہے اس سے تمہیں بڑی تکلیف پہنچی ہے اور مجھ کو تمہارے بارہ میں بدگمانی ہے اس وجہ سے محمد بن مسلمہ کو بھیج رہا ہوں کہ وہ تمہارا مال تقسیم کرلیں۔ یہ تم سے جو تفصیل طلب کریں اس سے ان کو باخبر کرو۔ اور جس چیز کا مطالبہ کریں، ان کے سامنے پیش کرو، اور اس سلسلہ میں ان کی طرف سے جو سختی ہو اس کو معاف کرو[1]"

حضرت خالد جیسے سپہ سالار کے متعلق جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک شاعر اشعث بن قیس کو دس ہزار درہم بطور انعام دیئے ہیں تو انہوں نے فوراً ابو عبیدہ کو لکھا کہ وہ خالد کے پاس جاکر ان کو خود ان کی پگڑی میں باندھ لیں اور ان کی ٹوپی اتار لیں اور دریافت کریں کہ انہوں نے اشعث کو جو رقم دی ہے، مال غنیمت میں سے دی ہے یا اپنی جیب سے دی ہے؟ اگر وہ اقرار کریں کہ سرکاری مال سے دی ہے تو یہ خیانت ہے اور اگر کہیں کہ اپنے پاس سے دی ہے تو یہ اسراف ہے اور ان دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے مستحق ہیں۔ اس وجہ سے ان کو معزول کردیں۔

اہلِ حق کے ساتھ نرمی اور اہلِ باطل کے ساتھ سختی

حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:۔

"اے لوگو! میں تمہارے معاملات کا ذمہ دار بنایا گیا ہوں تو سن رکھو کہ میری طبیعت کی مشہور سختی اور زیادہ بڑھ گئی ہے لیکن اب وہ ظالموں اور مسلمانوں پر زیادتی کرنے والوں کے لئے ہوگی۔ باقی رہے وہ لوگ جو سلامت روی، دینداری اور میانہ روی کی زندگی بسر کریں گے تو میں ان کے لئے اس سے بھی زیادہ نرم ہونگا، جتنے وہ آپس میں ایک دوسرے کے لئے ہوسکتے ہیں۔ میں کسی شخص کو دوسرے پر ظلم و زیادتی کرنے کا موقع نہ دونگا۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی جسارت کریگا تو میں اس کا ایک گال زمین پر رکھوں

[1] الفاروق عمر جلد دوم صفحہ ۱۹۵

گا۔ اور اس کا دوسرا گال اپنے پاؤں کے نیچے دباؤں گا۔ یہاں تک کہ وہ حق کے آگے جھک جائے۔ اور اس تمام سختی اور سخت گیری کے باوجود میں اہل دیانت کے لئے خود اپنا گال ہمیشہ زمین پر رکھوں گا۔"[1]

کفاف پر قناعت | اسلامی حکومت میں بڑی بڑی تنخواہوں، بھاری بھاری الاؤنسوں، چالیس چالیس ہزار روپے کی قیمت کے فرنیچر سے آراستہ کوٹھیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلامی حکومت کے ہر کارکن کو بالعموم اور اونچے درجہ کے کارکنوں کو بالخصوص اپنے آپ کو عوام کی سطح سے قریب تر رکھنا چاہیئے تاکہ لوگ ان کو نمونہ بنائیں اور سوسائٹی کے اندر اسراف، نمائش، گھمنڈ اور حق تلفی کی بیماری اور تنافس دنیا کی وبا نہ پھیلنے پائے۔ حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو پہلے تو وہ بیت المال سے سرے سے تنخواہ لینے ہی پر آمادہ نہیں ہوتے تھے لیکن بڑی ردّ وقدح کے بعد جب راضی ہوئے تو انہوں نے پہلے مسلمانوں سے دریافت کیا کہ ان کے لئے بیت المال سے اپنے مصارف کے لئے کتنی رقم لینی جائز ہے" حضرت ابوبکرؓ کو اس سوال کا جو جواب حضرت عمرؓ نے دیا اور جس پر تمام صحابہ نے اتفاق کیا یہ ہے:-

"فقال عمر انا واللہ اُخبرک	حضرت عمرؓ بولے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کے
ما لک منہ، اما ما کان	لئے بیت المال سے کس قدر لینا جائز ہے۔ آپ
لک من ولد قد بان عنک	کی اولاد میں سے جو آپ سے الگ ہو چکے ہیں، اور
فملک امرہ فسہمہ کرجل	اپنے معاملات کے خود ذمہ دار بن چکے ہیں ان کے لئے
من المسلمین، واما ما کان	تو بیت المال سے اسی طرح ایک مقرر حصہ ہے
من عیالک وضعفۃ اھلک	جس طرح ہر مسلمان کے لئے ہے۔ باقی جو بچے آپ کے
فتقوت منہ بالمعروف و	چھوٹے ہیں اور جو متعلقین اپنی ذمہ داری اٹھانے سے
قوت اھلک، فقال یا عمر!	قاصر ہیں تو ان کی اور اپنے اہل کی کفالت دستور کے
انّی لَاَخشٰی ان لا یحلّ لی	مطابق آپ بیت المال سے کر سکتے ہیں حضرت ابوبکرؓ
ان اُطعم عیالی من فیٔ المسلمین	نے فرمایا عمر! مجھے اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے فئے سے

[1] الفاروق عمر جلد اول ص ۹۶۔

فقال عمر یا خلیفۃ رسول الله! انك قد شُغلتَ بهذا الامر عن أنْ تكسب لعیالك[۱]

میرے لئے اپنے اہل وعیال کی پرورش جائز نہیں ہے؟ حضرت عمرؓ نے عرض کیا، اے خلیفہ رسول اللہ! اب آپ کا سارا وقت اس ذمہ داری نے سونت لیا ہے اور اپنے بچوں کی معاش کے لئے اب کوئی وقت آپ نہیں نکال سکتے۔"

حضرت ابوبکرؓ صدیق دوسال کچھ مہینے خلیفہ رہے۔ اس دوران میں بیت المال سے انہوں نے جو رقم اپنی ضروریات پر خرچ کی حساب کیا گیا تو وہ آٹھ ہزار درہم نکلی جس کے ہمارے حساب سے کم وبیش دو ہزار روپے ہوئے۔ یعنی انہوں نے اپنی ضروریات پر سَو روپے ماہوار سے بھی بہت کم خرچ کئے۔ اور یہ جو کچھ خرچ کیا، وہ بھی ان کی وفات کے بعد ان کی وصیّت کے مطابق بیت المال کو واپس کر دیا گیا۔

" ثم قال لهم اُنظروا ما ذا انفقتُ من بیت المال، فنظروا، فاذا هو ثمانیة الاف درهم فاوصی اهله اَنْ یؤدّوها الی الخلیفة بعده۔[۲]

پھر انہوں (حضرت ابوبکرؓ) نے لوگوں سے کہا معلوم کرو میں نے اپنے دورانِ خلافت میں اپنی ضروریات پر بیت المال سے کیا خرچ کیا ہے؟ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ کل آٹھ ہزار درہم۔ انہوں نے اپنے وارثوں کو وصیّت کی کہ ان کے بعد ہونے والے خلیفہ کو یہ رقم ادا کر دی جائے۔"

حضرت عمرؓ بیت المال سے اپنا جو حق سمجھتے تھے، اس کا اظہار انہوں نے خود ان الفاظ میں فرمایا تھا:

" انا اُخبرکم بما استحل منه، یحلّ لی حلّتان۔ حلّة فی الشتاء وحلّة فی القیظ، وما احج علیه واعتمر من الظّهر وقُوتی وقوت

میں بیت المال میں سے اپنی ضروریات کیلئے جو کچھ جائز سمجھتا ہوں، ایک جوڑا کپڑا جاڑوں میں اور ایک جوڑا گرمیوں میں پہنے کیلئے، سال بھر میں؛ اور حج اور عمرہ کے لئے ایک سواری، اور اپنی اور اپنے اہل کی معاش

۱؎ الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ جلد اول ص۱۸

۲؎ الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ جلد اول ص۱۹

اھلی کقوت رجل من قریش ، لیس باغناھم ولا با فقرھم۔ ثم انا بعد رجل من المسلمین یصیبنی ما اصابھم

قریش کے ایک متوسط درجہ کے آدمی کے برابر جو نہ امیر ہو نہ غریب۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کی جماعت کا ایک عام آدمی ہوں۔ بیت المال سے جس طرح ان کو حصہ ملے گا، اسی طرح جو کچھ میرا حصہ ہے، وہ مجھ کو ملے گا۔"

بیت المال کی شرعی حیثیت ان کے نزدیک جو کچھ تھی اور اس حیثیت کے لحاظ سے انہوں نے اپنے آپ کو ذاتی ضروریات کے لئے اس میں جس حد تک تصرف کا مجاز سمجھا تھا، اس کو بھی واضح فرما دیا تھا تاکہ کسی کو یہ خیال نہ گزرے کہ ان کا یہ طرزِ عمل محض احتیاط اور تقوے کا نتیجہ ہے۔ اس کی کوئی فقہی بنیاد نہیں ہے۔ ان کے نزدیک بیت المال کی حیثیت یتیم کے مال کی اور امیر کی حیثیت اس کے متولی کی تھی۔ یتیم کے مال کے اندر اس کے ولی کا حق، از روئے قرآن، صرف اس قدر ہے کہ اگر وہ محتاج ہو تو اپنا گذارہ اس میں سے دستور کے مطابق لے لے اور اگر مستغنی ہو تو حتی الامکان اس سے اپنا دامن بچائے۔ حضرت عمرؓ نے اس کی تصریح ان الفاظ میں فرمائی :-

انی انزلت مال اللہ منی بمنزلۃ مال الیتیم، فان استغنیت عففت عنہ وان افتقرت اکلت بالمعروف۔

میں نے اپنے لئے اللہ کے اس مال کو یتیم کے مال کے درجہ پر رکھا ہے۔ اگر میں اس سے مستغنی ہوں گا تو اس کے لینے سے احتراز کروں گا۔ اور اگر حاجتمند ہوں گا تو دستور کے مطابق اس سے اپنی ضرورتیں پوری کروں گا۔

اس شرعی نقطۂ نظر کی وجہ سے بیت المال کے معاملہ میں ان کی احتیاط تشدد کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ایک مرتبہ وہ بیمار ہوئے اور ان کو شہد کی ضرورت پیش آئی۔ بیت المال میں شہد موجود تھا لیکن انہوں نے از خود لینا گوارا نہ کیا۔ بالآخر جب بہت مجبور ہوئے تو اس کے لئے مسلمانوں سے اجازت طلب کی اور فرمایا کہ لوگ اگر اجازت دیں تو خیر ورنہ میرے لئے یہ حرام ہے۔

مسلمانوں نے جب دیکھا کہ بیت المال کے معاملہ میں حضرت عمرؓ کی احتیاط تشدد کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ اور وہ اپنے واجبی حق سے بھی فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں تو ان کا ایک وفد ام المؤمنین حضرت حفصہؓ (حضرت عمرؓ کی صاحبزادی) کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ امیرالمؤمنین نے بیت المال کے معاملہ میں اپنے اوپر غیر معمولی احتیاط لازم کرلی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اب آمدنی میں کافی گنجائش پیدا کردی ہے ان کو حق ہے کہ اس مال میں سے اپنی ضرورت کے مطابق جسقدر چاہیں لیں، تمام مسلمان پورے شوق کے ساتھ ان کو اس بات کے لئے اجازت دیتے ہیں۔ آپ ہماری طرف سے ان کی خدمت میں ہماری یہ خواہش پہنچا دیجئے۔ حضرت عمرؓ تشریف لائے تو حضرت حفصہؓ نے ان سے لوگوں کی اس خواہش کا ذکر کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:۔

"یا حفصہ بنت عمر! نصحت	اے عمر کی بیٹی حفصہ! تو نے اپنی قوم کے ساتھ تو
قومك وغششت اباك، انما	خیرخواہی کی لیکن اپنے باپ کے ساتھ بدخواہی۔ میرے
حق اھلی فی نفسی ومالی	اہل و عیال کا حق میرے جان اور مال میں ہے۔ باقی
فاما فی دینی وامانتی	میرے دین اور میری امانت کے اندر انہیں (دخل انداز
فلا[1]	ہونے کا) کوئی حق نہیں ہے۔"

حضرت علیؓ بیت المال کے معاملات میں جس غیر معمولی احتیاط سے کام لیتے تھے، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ مؤرخین نے تصریح کی ہے کہ معاویہؓ کے مقابلہ میں ان کی ناکامی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ معاویہ نے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے بیت المال کا روپیہ پانی کی طرح بہانا شروع کر دیا تھا اور حضرت علیؓ کا حال یہ تھا کہ وہ بیت المال کا ایک پیسہ بھی بغیر صحیح شرعی مصرف کے خرچ کرنے کے لئے تیار نہ تھے، نہ اپنی ذات پر نہ اپنے عزیزوں پر نہ دوسروں پر

ولم یکن یبنا ثومن الفیٔ بشیٔ	فے کے مال میں سے بیجا طور پر نہ خود ایک پیسہ لیتے تھے
ولا یخص به حمیما ولا قریبا[2]	اور نہ کسی دوست اور رشتہ دار کو دیتے تھے۔

---

[1] "الفاروق عمرؓ" تالیف محمد حسین ہیکل جلد ۲ صفحہ ۲۱۴ [2] الاستیعاب لابن البر جلد ۲ صفحہ ۴۶۴

حریف مقابل کی زرپاشیوں کے خطرناک نتائج ان کے سامنے برابر آتے رہے لیکن وہ اس بات پر راضی نہ ہوئے۔ کہ خدا کے مال میں اپنے حدود سے ہٹ کر کسی قسم کا تصرف کریں اگرچہ اس کے نتیجہ میں دنیا طلبوں کی ہمدردیوں سے ان کو یک قلم محروم ہی ہوجانا پڑے۔ اپنی ذات کے معاملہ میں وہ جسقدر محتاط تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے۔ کہ حضرت حسنؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے کل سات سو درہم چھوڑے تھے جو ایک خادم خریدنے کے لئے اپنی تنخواہ سے پس انداز کیے تھے[۱]

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ حال تھا کہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو پہلے اپنی بیوی فاطمہ کے پاس پہنچے جو عبدالملک کی بیٹی تھیں۔ ان کو آواز دی وہ حاضر ہوئیں تو ان کو دیکھ کر بہت روئے۔ اس کے بعد ان سے فرمایا کہ اب یا تو مجھے اختیار کرو یا اس قیمتی جوڑے کو جو تمہارے باپ عبدالملک نے ایک لاکھ دینار خرچ کر کے بنوایا تھا۔ اگر تم نے مجھے اختیار کیا تو میں اس جوڑے کو بیت المال میں داخل کردوں گا۔ اور اگر تم نے جوڑے کو اختیار کیا تو بس تم میری بیوی نہیں اور میں تمہارا شوہر نہیں۔ وہ بولیں، امیرالمومنین معاذاللہ میں آپ کو چھوڑ کر کپڑے کا جوڑا لے کر کیا کروں گی، آپ اس کو جو چاہیں کریں میں نے اس کے بارہ میں آپ کو پورا اختیار دیا۔

اسی دوران میں ان کا ایک بچہ پاس سے گذرا جس کا کرتہ پھٹ چلا تھا، اس سے فرمایا بیٹے اس میں پیوند لگوا لو۔ آج سے زیادہ تم اس کے محتاج کبھی نہیں تھے[۲]

اسلامی حکومت اپنے ملازمین اور کارکنوں کی تنخواہیں مقرر کرنے میں ان کی جن ضروریات کو پیش نظر رکھے گی، ان کی تصریح خود حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمادی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے :۔

من کان لنا عاملا فلیکتسب زوجۃ	جو ہمارا حکومت کا ملازم ہو۔ اگر اس نے شادی نہ کی ہو تو
فان لم یکن لہ خادم فلیکتسب خادما	شادی کرلے، اور اگر اس کے پاس کوئی خادم نہ ہو تو ایک
وان لم یکن لہ مسکنا فلیکتسب	خادم رکھ لے، اور اگر اس کے پاس مکان نہ ہو تو ایک

[۱] الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ صفحہ ۱۳۶۔ [۲] الامامۃ والسیاسۃ جلد ۲ صفحہ ۹۵۔

مسکنًا من اتخذ غیر ذلک فھو — مکان بنوالے۔ جو اس حد سے آگے بڑھے وہ خائن ہے

غال او سارق (شک من الراوی) — یا چور (راوی کو اس بارہ میں شک ہے کہ ان دونوں

(ابوداؤد، کتاب الخراج والفئی والامارۃ) — لفظوں میں سے آپ نے کونسا لفظ فرمایا)۔

یہ حدیث چھوٹے اور بڑے تمام ملازمین پر حاوی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت کے ملازمین اس کے ملازم ہونے کی حیثیت میں سب یکساں ہیں۔ اور حکومت یکساں طور پر ان کی ابتدائی ضروریات فراہم کرنے کے لئے ذمہ دار ہے۔ جہاں تک ذاتی ضروریات کا تعلق ہے، اسلامی نظام میں ایک امیر، ایک گورنر اور ایک چپڑاسی کی ضروریات میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں حکومت کے بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے کارکنوں کے لئے تنخواہوں کا معیار وہی تھا جو اوپر والی حدیث میں بیان ہوا ہے جس طرح تقسیم غنیمت کے وقت ایک معمولی سپاہی اور فوج کے سپہ سالار میں فرق نہیں کیا جاتا تھا اسی طرح تنخواہوں کے معاملہ میں ایک گورنر اور ایک تحصیلدار میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ بڑے عہدیداروں اور چھوٹے اہلکاروں دونوں کے لئے ایک ہی معیار تھا اور اس معیار کے تعین میں فیصلہ کن چیز ان کی ضرورت تھی۔ تاریخ کی کتابوں میں بلاشبہ بعض واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرات خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی بعض اعلیٰ عہدیداروں کو بیش قرار تنخواہیں دی گئی ہیں۔ لیکن وقت کے عام اصول کے خلاف اس قسم کے بعض شاذ واقعات جو ملتے ہیں، میں سمجھتا ہوں، ان کے نقل کرنے میں راویوں کو دھوکا ہوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس عہد میں مسلمانوں کو سرکاری خزانہ سے وظیفے بھی ملتے تھے اور اس میں سرکاری ملازمین اور عام مسلمان سب شریک تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ روایت کرنے میں بعض لوگوں کے وظائف کو غلط فہمی سے ان کی تنخواہوں کے ساتھ شمار کر لیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ رقم ایک خطیر رقم بن گئی ہے۔

وظائف کا ذکر زبان قلم پر آگیا ہے۔ تو ہر چند اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے لیکن صراحت مدعا کی خاطر ایک بات اس کے متعلق بھی سن لیجئے۔ وظائف کے بارہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دستور یہ تھا کہ فے کا جو مال ریاست کی ضروریات سے بچ رہتا، اس کو وہ عام مسلمانوں میں برابر تقسیم کر دیتے۔ کیونکہ اسلامی اصول

کے مطابق اس مال کے اصلی مالک عام مسلمان ہی تھے حضرت عمرؓ نے اس مساویانہ تقسیم پر ایک دوبار اعتراض کیا، ان کا خیال تھا کہ لوگوں کی دینی و اسلامی خدمات اور ان کے شرف تقدم کی بنا پر اس میں فرق کیا جانا چاہئیے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان کے اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ فرماتے تھے کہ خدمت دین اور قبول اسلام میں سبقت وغیرہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ وہ آخرت میں ہر ایک کو اس کا اجر دیگا۔ اور اس مال کا تعلق معیشت دنیا سے ہے، ہم ایک ایسی چیز کی بنا پر جس کا تعلق آخرت سے ہے۔ دنیاوی سامانِ معیشت کی تقسیم میں فرق کیوں کریں؛۔

جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنے اجتہاد کے مطابق حضرت ابوبکرؓ کے اس مساویانہ تقسیم کے طریقہ کو بدل دیا اور وظائف کی تقسیم کے لئے مندرجہ ذیل اُصول قائم کئے:۔

"الرجل وقدمته، الرجل	آدمی اور اسلام میں اس کا تقدم، آدمی اور اس کی
وبلائه، الرجل وعياله، الرجل	خدمات دینی، آدمی اور اس کے اہل وعیال، آدمی
وحاجته	اور اس کی ضروریات،

(ابو داؤد، کتاب الخراج والفئی والامارۃ)

لیکن اپنی وفات سے کچھ دن پہلے حضرت عمرؓ نے یہ رائے ظاہر فرمائی تھی۔ کہ اگر میں زندہ رہا تو وظائف کی تقسیم میں سب کو برابر کر دونگا۔ مگر قبل اس کے کہ عملاً اس کو نافذ کر سکیں انہوں نے شہادت پائی اور ان کا یہ ارادہ عملی شکل نہ اختیار کر سکا۔ تاہم اس سے یہ معلوم ہو گیا۔ کہ جہاں تک مال فے کی تقسیم کا تعلق ہے۔ اس کے بارہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ دونوں بزرگوں کی آخری رائے یہی تھی کہ اس کو تمام مسلمانوں میں برابر برابر تقسیم ہونا چاہئیے۔ یہی مذہب حضرت علیؓ کا بھی تھا اور اُنہوں نے اپنے زمانہ میں اس پر عمل کیا[1]

لیکن موجودہ زمانہ میں وظائف کے اس عام طریقہ کا سوال خارج از بحث ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں مسلسل فتوحات کے سبب سے بے حساب مال بیت المال میں آتا تھا اور ریاست کی ضروریات بہت سادہ اور مختصر تھیں۔ اس زمانہ میں ایک متمدن

---

[1] کتاب الاستیعاب لابن عبد البر جلد ۱، ص ۳۴۴۔

ریاست کی ضروریات بھی نسبتاً بہت وسیع ہیں اور فتوحات کا دائرہ بھی لازماً بہت محدود ہوگا۔ نیز اس زمانہ میں رفاہ عامہ کے بے شمار ایسے کام پیدا ہو گئے ہیں جن پر ایک ریاست بیت المال کا روپیہ خرچ کر کے اس سے کہیں زیادہ فائدہ باشندگان ملک کو پہنچا سکتی ہے جتنا انفرادی وظائف کی شکل میں متصور ہے

سرکاری مال کی حفاظت

اسلامی حکومت کے کارکنوں کو سرکاری مال کی جس طرح حفاظت کرنی چاہیئے اس کی مثال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قائم کردی ہے۔ اور یہ مثال شاید دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ وہ بھاگے ہوئے مدینہ سے باہر چلے جا رہے ہیں۔ حضرت علیؓ نے دریافت فرمایا۔ امیر المومنین، اس دھوپ میں کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ فرمایا: بیت المال کا ایک اونٹ کھو گیا ہے اس کو ڈھونڈھنے جا رہا ہوں۔ حضرت علیؓ نے یہ سنا تو فرمایا۔

قد تعبت الخلفاء بعدک — آپ نے اپنے بعد آنے والوں کو تھکا دیا۔

یعنی اگر معیار خدمت و امانت یہ ہے تو کون ہے جو آپکا مقابلہ کر سکے گا اور آپ کے بعد کانٹوں کا یہ تاج پہننے کی کون ہمت کریگا؟ [لہ]

امیر و مامور میں مساوات

اسلامی نظام کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام اس امر کو ایک لمحہ کے لئے بھی جائز قرار نہیں دیتا کہ جن لوگوں کو کسی درجہ میں بھی مسلمانوں کی سرداری سونپی جائے، وہ دوسروں پر اپنا تفوق جتائیں اور روزمرہ کی زندگی میں ان کے اوپر اپنے لئے امتیاز اور ترجیح کی نمائش کریں۔ اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق، اور عمر بن عبد العزیز نے جو تصریحات فرمائی ہیں وہ ہم مختلف عنوانات

لہ مجھے یاد آتا ہے کہ شاید اسی موقعہ پر یا اسی قسم کے کسی اور موقع پر حضرت عمر فاروقؓ کو دیکھا گیا کہ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں پسینہ میں تر اور بیت المال کے اونٹ ہانکتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے عرض کیا، امیر المومنین میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ یہ تکلیف کیوں فرماتے ہیں، آپ سایہ میں آ جائیے میرے یہ غلام اونٹ پہنچا دیں گے حضرت عمرؓ نے جواب میں ارشاد فرمایا، آپ لوگ سایہ میں آرام کیجئے، یہ بوجھ اسی کے اٹھانے کا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو ڈالا ہے۔

کے تحت نقل کر آئے ہیں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہم بعض ایسے واقعات نقل کرتے ہیں جن سے ایک اسلامی حکومت کا عام ماحول نگاہوں کے سامنے آئے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ جب کسی نظام کی بنیاد فی الواقع خدائے وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت پر قائم کی جاتی ہے تو اس کے ہر گوشہ میں عدل اور مساوات کی کیسی نورانیت پھیل جاتی ہے اور وہ طبقہ اس کے اندر سے کس طرح مٹ جاتا ہے جو یزداں و ستوں پر خدائی کرنے کا آرزو مند ہوتا ہے۔

"فتوحات عراق کے سلسلہ میں ایک جگہ مقامی باشندوں نے سپہ سالار فوج حضرت ابو عبیدہؓ کی خدمت میں کوئی خاص کھانا بطور تحفہ بھیجا، اور یہ کہلایا کہ یہ خاص آپ کے لئے ہدیہ ہے۔ انہوں نے دریافت کیا، کیا تم نے اس قسم کی ضیافت فوج کی بھی ہے؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ یہ سن کر انہوں نے ان کی ضیافت قبول کرنے سے انکار کیا اور فرمایا:

لا حاجة لنا فيه، بئس المرء ابو عبيدةؓ	ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ابو عبیدہ سے زیادہ برا
ان صحب قوما من بلادهم و	آدمی کون ہو سکتا ہے جو اپنی قوم کے لوگوں کو لے کر
اهراقوا دماءهم دونه او لم	آئے اور وہ اس کے حکم پر اپنا خون بہائیں اور جب مال
يهرقوها، فاستأثر عليهم بشيء يصيبه	غنیمت ہاتھ آئے تو وہ کسی چیز میں ان کے اوپر اپنے
لا والله، لا يأكل مما افاء الله	آپ کو ترجیح دے۔ نہیں، خدا کی قسم، یہ بندۂ خدا
عليهم الا مثل ما ياكل	کے ان بخشے ہوئے مالوں میں سے صرف وہی کھائے گا
اوساطهم[1]	جو دوسرے لوگ کھائیں گے"

مصر میں عمرو بن عاص سے صلح کی بات چیت کے لئے مقوقس نے اپنے سفیر بھیجے۔ جب سفیر واپس آئے تو مقوقس نے ان سے اسلامی فوج کا حال پوچھا۔ رئیس سفارت نے اس کے جواب میں اسلامی فوج کی یہ تصویر کھینچی:-

"ليس لاحد منهم في الدنيا | ان میں سے کسی کے دل میں دنیا کی کوئی طلب اور

---

[1] الفاروق عمرؓ تالیف محمد حسین ہیکل جلد ۲ ص ۱۱۲۔

رغبۃ ولا نہمۃ، وانما جلوسہم على التراب واکلہم على رکبہم، امیرہم کانہ واحد منہم ما یعرف رفیعہم من وضیعہم ولا السید من العبد واذا حضرت الصلوۃ لم یتخلف عنہا فیہم احد، یغسلون اطرافہم بالماء ویخشعون فی صلوتہم	حرص نہیں ہے، وہ زمین پر بیٹھتے ہیں، زانو پر رکھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ ان کا امیر انہی کے برابر کا ایک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ان کے درمیان شریف، رذیل اور آقا اور غلام کا کوئی امتیاز نہیں ہے، جب نماز کا وقت آتا ہے تو مجال نہیں کہ کوئی غیر حاضر ہو، پانی سے ہاتھ منہ دھوتے ہیں اور نہایت خشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں:

مقوقس نے یہ تقریر سن کر کہا، اس ذات کی قسم جس کی قسم کھائی جاتی ہے کہ اس قسم کے لوگ اگر پہاڑوں پر بھی حملہ کر دیں گے تو ان کو بھی ان کی جگہ سے سرکا دیں گے، دنیا کی کوئی قوم بھی ایسے لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔[1]

ریاست کی للہ و فی اللہ خدمت | اسلامی ریاست کی خدمت ایک عبادت ہے۔ اور یہ عبادت خدا کے ہاں مقبول نہیں ہو سکتی جب تک حصولِ اقتدار اور ہوسِ شہرت کی آلودگیوں اور ایک دوسرے کو گرانے اور پچھاڑنے کی خواہشوں اور کشمکشوں سے بالکل پاک نہ ہو۔ ابن کثیر کا بیان ہے کہ حضرت خالدؓ دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھے کہ حضرت ابوعبیدہؓ کو امیر المومنین کا حکم نامہ پہنچا کہ خالد کو معزول کر کے فوج کی قیادت تم سنبھالو لیکن حضرت ابوعبیدہؓ نے اس بات کو راز رکھا۔ یہاں تک کہ دمشق فتح ہو گیا اور اس حکم نامہ کو آئے ہوئے پورے بیس دن گزر گئے۔ اس کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت خالدؓ کو اطلاع دی۔ تو روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت خالدؓ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے۔ جس وقت یہ حکم آیا آپ نے اس کی اطلاع مجھے اسی وقت کیوں نہ دی؟" حضرت ابوعبیدہؓ نے اس کے جواب میں فرمایا۔

انی کرہت ان اکسر علیک حربک وما سلطان الدنیا ارید، ولا للدنیا	میں نے اس بات کو ناپسند کیا، کہ آپ کی جنگ میں رخنہ پیدا کروں۔ میں نہ تو دنیا کا اقتدار چاہتا اور نہ دنیا کے لئے

[1] "الفاروق عمر" بیت محمد حسین ہیکل جلد ۲ ص ۱۱۳۔

اعمل وما ترے سیصیر الی زوال	کام کرتا تھا، یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، سب فانی ہے
وانقطاع وانما نحن اخوان وما یضر	اور پھر ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور ایک بھائی کے
الرجل ان یلیہ اخوہ فی دینہ	دین یا اس کی دنیا کو اس بات سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے
ودنیاہ	کہ اس کا دوسرا بھائی اس پر حاکم ہو!"

اس کے ساتھ ساتھ اس خط کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو حضرت خالدؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو اس وقت لکھا تھا جب حضرت ابوبکرؓ نے اس فوج کی قیادت حضرت خالدؓ کے سپرد کر دی تھی۔ جو شام میں حضرت ابوعبیدہؓ کی ماتحتی میں تھی۔ حضرت خالدؓ لکھتے ہیں:۔

"اتانی کتاب خلیفۃ رسول اللہ صلی	میرے پاس خلیفۂ رسول اللہ کا حکم نامہ آیا ہے۔ کہ میں
اللہ علیہ وسلم یأمرنی بالمسیر الی الشام	شام جا کر وہاں کی فوج کی نگرانی اور اس کی قیادت
وبالمقام علی جندھا والتولی لامرھا۔	اپنے ہاتھ میں لے لوں۔ اللہ گواہ ہے کہ نہ میں نے اس
واللہ ما طلبتُ ذلک، ولا اردتہ،	کے لئے کوئی درخواست کی اور نہ اس باب میں ان کو کوئی
ولا کتبت الیہ فیہ۔ انت رحمک	خط لکھا۔ آپ اللہ آپ پر رحم فرمائے بدستور اپنی جگہ پر
اللہ علی حالک التی کنتَ علیھا	رہیں گے۔ آپ کے کسی حکم یا رائے کی خلاف ورزی نہ ہوگی
لا یُعصیٰ امرک ولا یُخالف رایک و	اور نہ ہی بغیر آپ کے مشورے کے کوئی بات طے پائے
لا یُقطع امر دونک فانک سید من	گی۔ آپ مسلمانوں کے سردار ہیں، نہ آپ کے مرتبہ کا انکار
سادات المسلمین، لا ینکر فضلک	ممکن ہے اور نہ آپ کی رائے سے بے نیاز ہوا جا سکتا
ولا یستغنی عن رایک تمم اللہ ما بنا	ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اوپر اور آپ کے اوپر اپنے احسان
وبک من الاحسان ورحمنا وایاک	کو کامل کرے، اور ہم کو جہنم کے عذاب سے بچائے۔"
من عذاب النار[1]	

حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت خالدؓ دونوں حضرات ایک درجہ کے سپہ سالار تھے، اور دونوں صاحبوں

[1] "الفاروق عمر" صفحہ ۱۳۰۔

کی عزت اور سرفرازی کا میدان بھی بالکل ایک ہی تھا۔ اس وجہ سے ان کے درمیان رقابت کی کشمکش پیدا ہونے کے لئے نہایت زبردست محرکات موجود تھے اور بالخصوص وہ مواقع تو بڑے ہی فتنہ انگیز تھے، جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ لیکن جو لوگ اللہ کے لئے جینے اور اللہ کے لئے مرنے کا عزم لے کر اٹھے تھے وہ نازک سے نازک آزمائشوں میں بھی اپنے اخلاصِ خدمت کو نفس کی آلائشوں سے ملوث نہیں ہونے دیتے تھے۔

ریاست کے خرچ پر اقربا نوازی سے احتراز ۔

اسلامی ریاست کے کارکنوں کو جن باتوں سے احتراز کرنا چاہیئے ان میں سب سے مقدم ریاست کے خرچ پر اقربا نوازی ہے۔ اقربا نوازی وصلہ رحمی بنیادی نیکیوں میں شامل ہے۔ بلکہ اسلام میں توحید کے بعد سب سے بڑی نیکی یہی ہے۔ لیکن اس سے بڑی کوئی برائی بھی نہیں ہے اگر اس کو ریاست کے خرچ پر انجام دینے کی کوشش کی جائے۔ اس معاملہ میں ذراسی اجتہادی غلطی حضرت عثمان غنیؓ جیسے پاکیزہ نفس خلیفہ راشد سے ہوگئی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس امت کا پورا شیرازہ درہم برہم ہوگیا۔ اسی وجہ سے حضرت عمرؓ نے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کے انتخاب کے لئے جو مجلس شوریٰ بنائی، اس کے ارکان کو سب سے پہلے جس بات کی ہدایت فرمائی وہ یہی تھی کہ ان میں سے جو شخص بھی خلیفہ بنایا جائے وہ اپنے اقتدار سے فائدہ اٹھا کر اپنے عزیزوں کو مسلمانوں کی گردن پر لادنے کی کوشش نہ کرے۔ ان کے اپنے الفاظ اس سلسلہ میں یہ ہیں :-

"انشدک اللہ یا علی ان ولیت
میں تم کو واسطہ دیکر اے علیؓ تم سے یہ کہتا ہوں کہ

من امور الناس شیئاً ان تحمل بنی
اگر مسلمانوں کے معاملات کی کوئی ذمہ داری تم پر ڈالی جائے

هاشم علی رقاب الناس،
تو تم بنی ہاشم کو لوگوں کی گردن پر لادنے کی کوشش نہ کرنا

انشدک اللہ یا عثمان ان ولیت
اور میں اللہ کا واسطہ دیکر اے عثمانؓ تم سے یہ کہتا ہوں

من امور الناس شیئاً ان تحمل
کہ اگر مسلمانوں کے معاملات کی کوئی ذمہ داری تم پر

بنی معیط علی رقاب الناس،
ڈالی جائے تو تم بنی معیط کو لوگوں کی گردن پر لادنے

انشدک اللہ یا سعد ان
کی کوشش نہ کرنا اور میں اللہ کا واسطہ دیکر اے

ولیت من امور الناس شیئاً
سعدؓ تم سے یہ کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کے معاملات

ان تحمل اقاربک علی رقاب الناس — کہ کوئی ذمہ داری تم پر ڈالی جائے تو تم اپنے قرابتداروں کو لوگوں کی گردنوں پر لادنے کی کوشش نہ کرنا

حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد خود اپنے خاندان کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ اس سلسلہ میں احتیاط کی بہترین مثال ہے۔ انہوں نے وظائف کی تقسیم کے لئے جب دفتر قائم کئے تو باوجودیکہ لوگوں کا عام اصرار یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کے لوگوں کو سرِ فہرست رکھیں لیکن انہوں نے خاندانِ رسالت کو مرکز قرار دے کر دوسروں کو مقدم رکھا اور اپنے خاندان کے لوگوں کو سب سے پیچھے ڈال دیا۔ جب حضرت عمرؓ کے خاندان، بنی عدی، کو اُن کے منصوبہ کا پتہ چلا تو ایک وفد کی صورت میں وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے درخواست کی کہ قوم نے ان کو جو جگہ دی ہے، وظائف کی فہرست میں وہ اپنے آپ کو اور اپنے اہلِ خاندان کو اسی جگہ رکھیں۔ حضرت عمرؓ نے اہلِ وفد کی یہ تقریر سُنی تو ان کو نہایت غضب آلود نگاہوں سے دیکھا اور بولے بنی عدی! چلو پرے ہٹو! تم میرے بل پر کھانا چاہتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر اپنی نیکیاں برباد کروں! نہیں، خدا کی قسم، جب تک تمہاری پکار نہ ہو تم ہرگز نہ آنا میرے اس دفتر میں سب سے پیچھے تمہارے نام ہونگے۔ مجھ سے پہلے میرے دو پیشرو اس راہ پر چل چکے ہیں۔ اگر میں ان کے خلاف روش اختیار کروں گا تو میری راہ ٹیڑھی ہو جائے گی۔ خدا کی قسم، میں نے دُنیا میں جو عزت پائی ہے اور آخرت میں جس اجر کا امیدوار ہوں وہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی برکت سے ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہمارے شرف ہیں اور وہ تمام عرب میں سب سے اشرف ہیں۔ اس کے بعد الاقرب فالاقرب کا لحاظ ہوگا۔ یعنی جو لوگ جس درجہ میں آنحضرت سے جتنے قریب ہوں گے۔ اسی اعتبار سے ان کے حقوق ہونگے۔

اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ مختلف مواقع پر حضرت عمرؓ نے جو معاملہ کیا۔ ایک عام آدمی تو اس کو صریح حق تلفی پر محمول کرے گا لیکن اسلام ناجائز اقربا پروری کا جس شدت کے ساتھ قلع قمع کرنا چاہتا ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ اس معاملہ میں وہ یہی متشددانہ رویہ اختیار کریں۔ تاکہ ان کا عمل دوسروں کے لئے نمونہ کا کام دے۔

وفات کے وقت ایک شخص نے آپ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے علم و تقویٰ کی تعریف کرنے کے بعد کہا کہ انہیں امیرالمومنین بنا دیجیے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ تمہارا برا ہو تم نے یہ بات اچھی نیت سے نہیں کہی۔ میں ایک ایسے شخص کو کیسے خلیفہ بنا سکتا ہوں جو اپنی بیوی کو طلاق بھی ٹھیک طور سے نہیں دے سکتا۔ اب ہم کو تمہارے مسلمانوں کے معاملات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یہ چیز (امامت) اچھی تھی تو ہم نے اس میں سے اپنا حصہ پا لیا اور اگر بری تھی تو خطاب کو اس سے ہٹا دیا۔ آلِ عمر کے لئے یہ بس ہے کہ ان میں سے ایک آدمی سے اس کے بابت بھی سوال کیا جائے اور امت محمدیہ کے بارہ میں بھی اس سے بازپرس ہو۔ میں نے اپنے آپ کو اس میں مشقت ڈالا، اور اپنے بیوی بچوں کو ان کے بہت سے حقوق سے محروم رکھا۔ تاہم اگر برابر برابر پر چھوٹ جاؤں ___ نہ اس میں میرے لئے کوئی نفع ہو نہ نقصان ___ تو میں اپنے تئیں خوش قسمت سمجھوں گا۔

جب لوگوں نے شدت کے ساتھ اصرار کیا کہ اپنے بعد اپنا کوئی جانشین نامزد کر دیجئے۔ تو فرمایا۔ میں اس چیز کا حقدار ان لوگوں سے زیادہ کسی کو نہیں سمجھتا جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے وقت راضی تھے۔ اس کے بعد حضرت علی، عثمان، زبیر، طلحہ اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم کے نام لئے اور فرمایا مشورہ کی حد تک عبداللہ بن عمرؓ ان لوگوں کے ساتھ شریک ہوں گے لیکن خلافت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

مہاجرین اولین کے لئے حضرت عمرؓ نے چار چار ہزار درہم کے وظائف مقرر کئے۔ قاعدہ سے اسی زمرہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی آتے تھے۔ لیکن ان کا وظیفہ آپ نے صرف ساڑھے تین ہزار مقرر کیا۔ جب سوال کیا گیا کہ ان کے ساتھ یہ امتیاز کیوں کیا جا رہا ہے تو جواب دیا کہ ان کو ان کے باپ نے ہجرت کرائی تھی پھر وہ ان لوگوں کا درجہ کیسے پا سکتے ہیں جنہوں نے خود ہجرت کی۔

پارٹی بازی سے احتراز

اس زمانہ میں "پارٹی" کا فتنہ سب سے بڑا فتنہ ہے۔ جمہوریت میں جو پارٹی برسر اقتدار آجاتی ہے۔ وہ نہ صرف تمام حقوق اپنے لئے خاص کر لیتی ہے۔ بلکہ اس کے ارکان کو ہر قسم کی بدعنوانیوں اور بے ایمانیوں کے لئے چھوٹ بھی مل جایا کرتی ہے۔ پارٹی کے ہر بڑے اور چھوٹے۔ پارٹی کے مفاد کو حق و باطل کا

معیار ٹھہرا لیتے ہیں۔ جو چیز ان کی پارٹی کے لئے مفید ہے وہ حق ہے اگرچہ عقلی و اخلاقی نقطۂ نظر سے وہ کتنی ہی غلط اور کتنی ہی باطل ہو۔ اور جو بات ان کی پارٹی کے مفاد کے خلاف ہے وُہ باطل ہے۔ اگرچہ اس کے حق ہونے کی شہادت خدا، اس کے فرشتوں اور رسولوں سب نے دی ہو جس نظام میں پارٹی بازی کا یہ زہر پھیل جاتا ہے اس کی ہر چیز اس کے اثر سے اس طرح مسموم ہو جایا کرتی ہے کہ پھر اس کے کسی شعبہ کے لئے ممکن ہی نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنا طبعی وظیفہ (Duties and Oblirations) ایمانداری کے ساتھ انجام دے سکے۔ اس کا سارا نظم ونسق پارٹی کے مفاد کے محور کے گرد گھومنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا عدالتی نظام بھی سارے معاملات کو پارٹی کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ اور پورا نظام اجتماعی اس فساد سے بالکل اسی طرح متاثر ہو جاتا ہے، جس طرح اس شخص کا نظام جسمانی جس کو باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہو۔ یہ عصبیتِ جاہلیت اسلام کے بالکل خلاف بلکہ اس کی عین ضد ہے، اسلامی نظام زندگی میں حق و باطل کا معیار ان ساری چیزوں سے بالا اور برتر اللہ کی مرضی اور اس کی شریعت ہے۔ جو شخص اس چیز کے سوا کسی اور عصبیت و حمیت میں مبتلا ہو وہ خدا کے دین کو نہیں قائم کر سکتا۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ بہت سی قیمتی نصیحتوں کے ساتھ اس حقیقت کو بھی واضح فرما دیا ہے۔ انہوں نے فرمایا:۔

" اللہ کی شریعت کو قائم نہیں کر سکتا مگر وہ شخص جو نمائشی حرکتیں کرنے والا نہ ہو۔

اللہ کی شریعت کو قائم نہیں کر سکتا مگر وہ شخص جو لنگوٹ پیٹ کو پسند کرنے والا نہ ہو۔

اللہ کی شریعت کو قائم نہیں کر سکتا مگر وہ شخص جو لالچ میں پڑنے والا نہ ہو۔

اللہ کی شریعت کو قائم نہیں کر سکتا مگر وہ شخص کہ حق کے معاملہ میں اپنی پارٹی کی ناانصافیوں کو گوارا کرنے والا نہ ہو (ولا یکظم فی الحق علیٰ حزبہ[1]) "

اسی حقیقت کو ایک خطبہ میں نہایت واضح الفاظ میں یُوں سمجھایا ہے:۔

ایک حاکم کو سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنی رعایا کے اندر جو چیز دیکھنی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ کے جو حقوق و فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں ان کو وہ ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ ہمارا فرض صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس

---

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۸ - ۹ -

چیز کا حکم دیا ہے، لوگوں کو اس چیز کا حکم دیں اور اس نے جس چیز سے روکا ہے، اس سے لوگوں کو روکیں اور قریب و بعید سب کے بہ صرف حق کو قائم کریں اور اس بات کی مطلق پروا نہ کریں کہ حق کس کے خلاف جا رہا ہے۔

حاجب و دربان سے احتراز اوپر مختلف عنوانات کے تحت ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ وعیدیں نقل کر چکے ہیں، جو آپ نے ان حکام کو سنائی ہیں جو اپنے اور رعایا کے درمیان دیواریں کھڑی کرتے ہیں اور ان کی ضروریات اور مشکلات کے سننے کے لئے اپنے دروازے کھلے نہیں رکھتے۔ یہاں ہم ایک حدیث پیش کرتے ہیں عمرو بن مرہ کی روایت امام احمد اور ترمذی نے کی ہے اور جو اس باب میں نہایت اہم ہے:۔

"عن عمرو بن مرة قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول مامن امام او وال يغلق بابه دون ذوى الحاجة والخلة والمسكنة الا اغلق الله ابواب السماء دون خلته وحاجته ومسكنته"	عمرو بن مرہ راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا کہ جو امیر یا والی ضرورت مندوں، حاجت مندوں اور اہل فقر کے لئے اپنے دروازے بند رکھیگا اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت، حاجت اور احتیاج کے دن اس کے لئے آسمان کے دروازے بند کر دے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نہایت واضح ارشاد کی بنا پر امام شافعی اور ایک جماعت کے نزدیک کسی حاکم کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ حاجب و دربان مقرر کرے۔ ایک دوسرے گروہ نے اگرچہ اس کی اجازت دی ہے لیکن انہوں نے بالعموم تین شرطیں لگائی ہیں:۔

(۱) یہ کہ اس کا مقصد ذاتی آرام نہ ہو بلکہ اس سے لوگوں کی سہولت، وقت کی بچت اور کام میں ترتیب پیش نظر ہو۔

(۲) دوسرے یہ کہ ملاقاتوں کے معاملہ میں اس اصول کا التزام ہو کہ جو پہلے آئے اس سے پہلے ملاقات کی جائے اور باہر سے آنے والوں کو مقامی ملنے والوں پر ترجیح دی جائے۔ ذاتی تعلقات، وجاہت، اسغدش اور اس قسم کے امتیازات کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے۔

ٖ۔ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۸۔

(۳) وہ بااعتماد، قابل اعتماد، پاکباز، خوش خلق، لوگوں کے مرتبہ کو پہچاننے والا ہو۔[1]

جھوٹی وکالت اور باطل حمایت سے احتراز — اسلام میں جھوٹی وکالت اور باطل حمایت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

"من اعان علی خصومۃ بظلم فقد باء بغضب من اللہ" (ابوداؤد)

جس نے کسی جھگڑے میں ظلم کے ساتھ مدد کی وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا۔

کسی جھگڑے میں ظالم کی اعانت کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔ جو لوگ کسی ظالم کی اس طرح اعانت کریں گے وہ اللہ کے فضل کے مستحق ہوں گے۔ مگر جو لوگ کسی جاہلی عصبیت اور شیطانی حمیت کے تحت یا محض کسی غرض ذاتی کے لئے اس کے ظلم میں شریک ہو جائیں گے۔ وہ اپنے زعم میں ممکن ہے یہ خیال کریں کہ وہ اپنے ایک بھائی کی حمایت میں ایک بڑا جہاد کر رہے ہیں لیکن وہ فی الحقیقت اللہ کا غضب لے کر لوٹیں گے۔

ایک دوسری حدیث میں اس سے بھی زیادہ سخت وعید وارد ہے:۔

"من حدیث اوس بن شرحبیل انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من مشی مع ظالم لیعینہ وھو یعلم انہ ظالم فقد خرج من الاسلام۔"

اوس بن شرحبیل سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ جو شخص کسی ظالم کی مدد کے لئے نکلا۔ درآنحالیکہ وہ اس بات سے واقف ہے کہ یہ شخص ظالم ہے۔ وہ اسلام سے خارج ہو گیا:

یہ سخت وعید ان لوگوں کے لئے ہے جو اپنے بھائی کے ظلم میں اس کی مدد کسی جاہلی حمیت کے تحت کرتے ہیں، جاہلی حمیت اگرچہ اسلامی نقطۂ نظر سے ایک شیطانی محرک ہے تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ محرک ان محرکات سے کہیں افضل ہے جن میں صرف ذاتی اغراض اور ذاتی منافع کارفرما ہوتے ہیں پھر جب اس نسبتاً اشرف محرک کے تحت ظلم کی حمایت کرنے والوں کا یہ انجام ہوگا تو اسی سے ان لوگوں کے

---

[1] نیل الاوطار جلد [illegible] صفحہ ۲۴۵۔

انجام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو محض روپے اور اغراض کی خاطر ہر حق و باطل کی حمایت کو اپنا "پیشہ" بنا لیتے ہیں اور اس پیشہ میں زندگیاں گذار دیتے ہیں۔

رشوت سے احتراز انسان کے اندر جب سے اجتماعی زندگی کا شعور بیدار ہوا ہے اور اس نے یہ سمجھنا شروع کیا ہے کہ کیا چیزیں اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنے والی ہیں، اس وقت سے اس نے برابر رشوت کو ایک دشمنِ اجتماعیت بیماری کی حیثیت سے نہایت نفرت کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ ہر نظامِ اجتماعی کا انحصار ہے اس بات پر کہ اس کے اندر ایسے اہلِ بصیرت اور اہلِ بصارت موجود ہوں اور برابر موجود رہیں جو ان رخنوں کو بند کرتے ہیں جو اجتماعیت دشمن عناصر کی طرف سے پیدا کئے جاتے ہیں۔ رشوت اس بصیرت اور بصارت کو برباد کرنے والی دنیا میں ایک ہی چیز ہے۔ اس وجہ سے اگر کسی نظام کے اندر اس کا رواج زور پکڑ جائے تو اس کے اندر اول تو اہلِ بصیرت کا پیدا ہونا ہی مشکل ہے اور اگر اتفاق سے پیدا ہو جائے تو اس رشوت کے سرمہ کے ذریعہ سے ان کو بڑی آسانی سے اندھا کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس سوسائٹی کے اندر رشوت کا لین دین عام ہو آہستہ آہستہ اس کی باگ اندھے راہ دکھانے والوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ اور جو نظام صرف اندھوں کی راہنمائی میں چل رہا ہو اس کا انجام معلوم! رشوت کی اس ہلاکت انگیزی کی وجہ سے اسلام نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے دونوں کو اللہ کی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لعنة الله علی الراشی والمرتشی فی الحکم (احمد، ابوداؤد، ترمذی)

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عدل کے بارہ میں رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر اللہ کی لعنت ہے۔"

ایک اور حدیث میں رشوت دینے والے، رشوت لینے والے کے ساتھ ساتھ رشوت کا معاملہ کرانے والے دلال کو بھی اس جرم اور اس کی سزا میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت نظامِ اجتماعی کو درہم برہم کرنے والی اس سازش کا ایک بڑا اہم عامل وہ بھی ہوتا ہے۔

"عن ثوبان قال لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم الراشی والمرتشی و

ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے، رشوت لینے والے، اور رشوت دلانے

الرائشی یعنی الذی یمشی بینہما (رواہ احمد)

دلالے یعنی اس شخص پر جو بیچ میں دلالی کرتا ہے لعنت کی ہے

ہدیے اور تحفے قبول کرنے سے احتراز اجتماعی زندگی کو خوشگوار اور باہمی تعلقات کو زندہ رکھنے کے لئے مسلمانوں کو اس بات کی بڑی تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنے عزیزوں اور پڑوسیوں کو ہدیے اور تحفے بھیجیں اور ان کی طرف سے جو چیز آئے اس کو قبول کریں لیکن عام مسلمانوں کو اس کی جتنی ہی ترغیب دی گئی ہے، سرکاری حکام کو اسی شدت کے ساتھ ہدیے اور تحفے قبول کرنے سے روکا گیا ہے کیونکہ یہ چیز رشوت پیش کرنے اور رشوت قبول کرنے کے لئے ایک "چور دروازہ" کا کام دے سکتی ہے۔

عن ابی حمید الساعدی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھدایا العمال غلول (احمد)

ابو حمید الساعدی سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمال کا ہدیہ قبول کرنا خیانت ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے:۔

"قال من استعملنا ہ علی عمل فرزقنا رزقا فما اخذ بعد ذلک فھو غلول" (ابوداؤد)

ابو حمید ساعدی سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمال کا ہدیہ قبول کرنا خیانت ہے۔

بخاری، مسلم اور ابوداؤد تینوں میں یہ روائت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ازد پر ایک صاحب کو تحصیلدار مقرر کیا جن کا نام ابو اللتبیہ تھا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس آئے تو انہوں نے حساب دیتے ہوئے کہا، یہ بیت المال کا حصہ ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ کے ملا ہے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا جس میں اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے جو انتظام میرے سپرد فرمایا ہے اس میں تم میں سے بعض لوگوں کو میں جب کسی خدمت پر مقرر کرتا ہوں اور وہ اس سے فارغ ہو کر واپس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ تمہارا (بیت المال کا) حصہ ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے۔ اگر وہ اس بات میں سچے ہیں تو اپنے ماں باپ کے گھر میں کیوں نہیں بیٹھے رہے کہ وہیں بیٹھے بیٹھے ان کے پاس ہدیے آجاتے!

بین الاقوامی تعلقات و روابط کو مستحکم کرنے کے لئے اسلامی حکومت کے امیر کو تحائف کے تبادلہ کی

اجازت دی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سلاطین آپکی خدمت میں ہدیے بھیجتے تھے اور آپ ان کو قبول بھی فرماتے تھے لیکن معمول یہ تھا کہ آپ ان چیزوں کو صحابہ (لوگوں) میں تقسیم فرما دیتے تھے جس طرح مال غنیمت میں سے صفی لینے کا دستور تھا اسی طرح اگر آنحضرتؐ کو کوئی چیز پسند آجاتی تو اس میں سے لے لیتے ورنہ ساری کی ساری صحابہ میں تقسیم فرما دیتے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ آپ کے پاس دیبا کی قبائیں آئیں جن پر سونے کا کام تھا۔ آپ نے صحابہ میں تقسیم فرما دیں اور ایک ان میں سے مخرمہ بن نوفل کے لئے الگ کر لی۔ مخرمہ اپنے بیٹے مسور کے ساتھ آپکی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر دروازہ پر ان کی آواز سنی تو خوش ہو کر خیر مقدم کیا۔ ان کو اندر بلایا اور فرمایا ابوالمسور میں نے یہ تمہارے لئے چھپا رکھی تھی۔ اسی طرح مقوقس نے ماریہ اور سیرین کو آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجا۔ آپ نے ان میں سے سیرین کو حضرت حسان کو ہبہ کر دیا۔ مقوقس نے ایک گدھا اور خچر بھی آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ نجاشی نے آپکی خدمت میں ہدیہ بھیجا۔ آپ نے اس کے ہدیہ کو قبول بھی فرمایا اور خود بھی اس کے پاس ہدیہ بھیجا۔ فروہ بن نعاثہ جذامی نے آپکی خدمت میں ایک سفید خچر بھیجا جس پر آپ حنین کے دن سوار ہوئے۔ بخاری میں ہے کہ ایلہ کے بادشاہ نے آپ کی خدمت میں ایک سفید خچر بھیجا اور آپ نے اس کو ایک چادر بھیجی۔ بغرض ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے بادشاہوں کے ہدیے قبول بھی فرمائے اور ان کو ہدیے بھیجے بھی ہیں۔ البتہ اس امر میں علماء نے اختلاف کیا ہے کہ مسلمانوں کے امیر کے پاس اس قسم کے جو ہدیے آئیں گے وہ کس کی ملک ہوں گے امیر کی ذاتی ملک ہوں گے یا عام مسلمانوں کی؟ عام اور مشہور مذہب یہی ہے کہ اس قسم کی ساری چیزیں بیت المال کی ملک قرار پائیں گی۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں مسلمانوں کی ملک ہونگی اور امیر اسلام ان کا معاوضہ بیت المال سے دیگا۔ امام احمد اور انکے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ کفار مسلمانوں کے امیر یا ان کے سپہ سالار کو جو ہدیے وغیرہ پیش کریں گے انکی حیثیت مال غنیمت کی سی ہوگی اور اس پر مال غنیمت ہی کے احکام جاری ہوں گے۔[۵]

---

[۵] ۔ زاد المعاد جلد ۳ صفحہ ۲۹۶ ۔

رسائل و مسائل

نوٹ: اس مرتبہ کے رسائل و مسائل میں متعدد اہم سوالوں کے جواب دیئے جانے تھے اور ان کی کتابت بھی ہو چکی تھی، لیکن ترتیب صفحات کے وقت ان کے لئے جگہ نہ نکالی جاسکی۔ سائل حضرات اشاعت آئندہ کا انتظار فرمائیں:-

آئندہ انتخابات اور ملازمین حکومت

سوال:- جماعت اسلامی کے اصول میری نگاہ میں غلط نہیں، مگر میں ہمیشہ ایک ہمدرد مخالف کی حیثیت سے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ لوگوں کی پالیسی میں کوئی ایسی گڑبڑ ہے کہ آپ کے ہاں کی ٹیکنک میں کافی پیچیدگیاں نظر آتی ہیں، جو ہم لوگوں کے لئے اکثر تو قابل فہم ہی نہیں ہوتیں خصوصیت سے حکومت کے ملازمین میں سے جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں ان کے بارے میں آپ کے مطالبات کچھ پیچیدہ قسم کے ہیں۔ باقی امور کو تو اس وقت درکنار رکھیئے۔ میں صرف انتخابات کے بارے میں آپ کے ملازمین حکومت کا رویہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ دین و سیاست کی تفریق کے قائل نہیں۔ اور اس وجہ سے ملازم اور غیر ملازم ہر ایک سے آپ کا اصول جماعت کی ساری سرگرمیوں میں تعاون چاہتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انتخابات میں اگر جماعت حصہ لے رہی ہے تو وہ دین و سیاست کی وحدت کے اصول کے تحت ہی ہر شخص سے چاہے گی کہ وہ "انقلاب قیادت" کی جدوجہد میں پورا پورا حصہ لے۔ مگر ملازم ایسا نہیں کرسکتا۔ آخر آپ نے اس مسئلے پر کیا سوچا ہے۔ اگر آپ ملازمین سے انتخابات میں کنویسنگ کا کام لینے کے حق میں ہیں تو پھر حسب ذیل سوالات کا جواب کیا ہے؟

(۱) کیا آپ اخلاقاً ان ملازمین کے لئے بھی یہی حق تسلیم کرتے ہیں جو آپ کی جماعت کے مخالف اور دوسری جماعتوں سے دلچسپی رکھنے والے ہوں؟

(۲) کیا آپ کے اسلامی نظام کے اندر بھی ہر ملازم کو یہ حق ہوگا کہ وہ انتخابات میں جس کی حمایت و مخالفت

میں بھی اپنا اثر استعمال کرنا چاہیے، کرے؟

جواب:۔ جماعت اسلامی کے اصول تو بہر حال آپ کے نزدیک بھی حق ہیں، لہٰذا کوئی پیچیدگی اُن کی وجہ سے رونما نہیں ہوتی۔ اصل مشکل جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسے عبوری دور میں سے گذر رہے ہیں، جس میں ہماری ریاست اصولاً تو اسلامی بن چکی ہے، لیکن عملاً اس کا سارا نظام ابھی تعمیرِ نو کا محتاج پڑا ہے۔ فی الواقع یہ ایک انتہائی الجھی ہوئی صورتِ حالات ہے کہ ریاست تو اصولاً اسلامی ہے، نظامِ حکومت سارا پرانے غیر اسلامی نقشے پر کام کر رہا ہے، اربابِ قیادت اور حکام مجموعی حیثیت سے اسلام سے ذہناً نابلد اور عملاً کوسوں دور ہیں۔ ان حالات میں ریاست، حکومت اور قیادت میں سے ہر ایک کے حقوق جداگانہ ہیں اور ان سارے حقوق کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر ادا کرنے کے لئے جو جماعت اپنی اخلاقی ذمہ داری کو سمجھتی ہو، اسے اپنی پالیسی بنانے اور اسے نافذ کرنے میں لازماً پیچیدگیاں پیش آتی ہیں۔ بہر حال آپ کے اصل سوال کے جواب کی وضاحت کے لئے چند سطری جواب حوالۂ قلم کیا جا رہا ہے، خدا کرے کہ یہ سطور آپ کے لئے موجبِ اطمینان ہو سکیں۔

اوّلاً آپ یہ سمجھ لیجئے کہ اسلامی سیاست اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اسلام کے عقیدہ و نصب العین کی طرف عوام کو دعوت دی جائے، اسلامی اصولوں پر ان کو منظم کیا جائے، ان کے اخلاق کی صحیح تعمیر کی جائے اور ان کو اسلامی نظام کے قیام و نفاذ میں حصہ لینے کے قابل بنایا جائے ـــ دوسری طرف اسلام کے نصب العین سے ہٹانے والے محرکات کے اثر سے ان کو بچایا جائے، اور غیر اسلامی اخلاق سے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو پاک کیا جائے! یہ ہے اسلام کی پاکیزہ سیاست۔ اسی کو دینی اصطلاح میں "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کہتے ہیں، اور یہ ہر فردِ مسلم کا بھی اور ہر جماعتِ مسلمین کا بھی اور ہر حکومتِ اسلام کا بھی بنیادی فریضہ ہے۔ اس سے نہ عوام مستثنیٰ ہیں، نہ حکام! بس صرف اس سیاست کے لئے جماعت اسلامی ہر مسلمان سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو پورے جذبے کے ساتھ استعمال کرے، چنانچہ اس کا یہ مطالبہ ملازمین سے بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی عامی مسلمان سے ہے، بلکہ ملازمین سے خاص طور پر، کیونکہ شرعاً وہ پوری مملکت کے شہریوں کی تعلیم و تعلّم کے ذمہ دار ہیں۔ جیسے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے خلافتِ راشدہ

کے بار زمین پر ذمہ داری ڈالتے ہوئے فرمایا تھا :-

اللھم انی اشھدک علی امراء الامصار فانی بعثتھم یعلمون الناس دینھم وسنۃ نبیھم ویقسمون فیئھم ویعدلون علیھم (ازالۃ الخفاء)

اے اللہ میں تجھی کو مختلف علاقوں کے حکام پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان کو اسلیئے مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے دین کی اور ان کے نبی صلعم کی سنت کی تعلیم دیں اور ان میں اُن کے وظائف تقسیم کریں اور اُنکے معاملات میں انصاف کریں !

اور :-

الا وان اللہ انی ما ارسل عمالی الیکم لیضربوا ابشارکم ولا لیأخذوا اموالکم ولکن ارسلھم الیکم لیعلموکم دینکم وسنتکم

سُن لو ! خدا کی قسم میں نے اپنے حکام کو تمہارے پاس اسلئے نہیں بھیجا ہے کہ وہ تم کو کوڑے لگائیں اور نہ اس لیئے کہ وہ تمہارے مال چھینائیں ، بلکہ اس لیئے بھیجا ہے کہ وہ تم کو تمہارے دین اور تمہاری سنت کی تعلیم دیں ۔

اب آپ انتخابات کے مسئلے پر غور کیجئے ۔ اگر شرعاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری کے تحت ہر مسلمان سے بڑھ کر ملازمین حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے کے بارے میں عوام کو اسلام کی تعلیم دیں اور رہنمائی بہم پہنچائیں تو یقیناً انتخابات کے متعلق اسلام کی رہنمائی کو عوام تک پہنچانا عام شہریوں سے بڑھ کر ملازمین کا فریضہ ہے ۔ وزرا سے لے کر کلرکوں اور مدرسین اور پولیس کنسٹیبلوں کی دینی ڈیوٹی ہے کہ وہ انتخابات کے اسلامی اصولوں کو پھیلائیں اور ووٹ کی مقدس امانت کا صحیح مصرف ایک ایک مرد و عورت کو بتائیں اور ان کو غیر اسلامی عادات سے باز رکھنے کی کوشش کریں ۔

رہا ترغیب ، Canvassing ، کا معاملہ ، سو جس معنی میں یہ لفظ رائج ہے اس معنی میں اسلام اس کا سخت

مخالف ہے اور کسی ملازم کو تو کجا کسی شہری کو بھی اسکی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ووٹوں کی منڈی میں بیوپار کرنیوالوں کا واسطہ (Agent) یا لوگوں کو غلط فہمیوں میں ڈالے، یا جوڑ توڑ کی مہم میں حصہ لے یا جھوٹے اور فاسقانہ پروپگنڈے میں شریک ہو یا اغراض کی دھڑے بندیوں سے کوئی تعلق رکھے! اسلام میں کنویسنگ جائز نہیں، صرف "تعارف" جائز ہے!

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا ایک ملازم حکومت کو بھی "تعارف" کرانے کا حق حاصل ہے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔

اسلام کا ایک اصل الاصول یہ ہے کہ مشورہ و استصواب ہو یا انتخاب یا شہادت، ان میں سے کسی بھی صورت میں ایک فردِ مسلم کی آزادیٔ رائے کو سلب کرنا یا دبانا یا کمزور کرنا جائز نہیں ہے۔ حکومت کا وجود اس آزادیٔ رائے کی حفاظت کرنے کے لئے ہے، نہ کہ اسے کمزور کرنے کے لئے! اس اصول کی روشنی میں یہ بات کسی طرح جائز نہیں قرار پاتی کہ اکابرِ حکومت یا ملازمینِ حکومت اپنے اثر و رسوخ کو کسی شخص یا گروہ کی حمایت یا مخالفت کے لئے استعمال کریں۔

دورِ نبوت اور خلافتِ راشدہ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ ملازمینِ حکومت نے انتخابات میں اپنی آرا کو عوام میں واضح کر کے ان پر اثر ڈالنے کی کوشش کی ہو، بلکہ بخلاف اس کے ایسی نظیریں ملتی ہیں کہ مشورہ و استصواب میں آزادی رائے کو بچانے کے لئے خاص اہتمام کئے گئے ہیں۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی وفات سے پہلے جو کمیٹی نئے امیر کے انتخاب کے لئے مقرر کی تھی، اس میں اپنے بیٹے کو اس شرط پر شامل کیا تھا کہ کمیٹی ان کو منصب امارت کسی حال میں نہ دے گی۔ یہ اہتمام صرف اسی لئے تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کمیٹی کے ممبروں کی آزادیٔ رائے حضرت عمرؓ کے فرزند سے متاثر ہو جائے اور وہ ان کو صرف خلیفۂ دوم کا فرزند ہونے کی وجہ سے منتخب کر لیں۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ہر ملازم حکومت اپنے اپنے درجے کے لحاظ سے ایک خاص حد تک اثر رکھتا ہے اور اگر وہ اس اثر کو انتخابات میں استعمال کرے تو بہت سے شہریوں کی آزادیٔ رائے کو سلب یا کمزور کر سکتا ہے —— یہاں تک کہ ایک عہدہ دار یا ملازم کا یہ تک کہنا کہ میں فلاں کا ووٹ دوں گا،

بسا اوقات عوام کی آزادیٔ رائے کو کمزور کر دیتا ہے۔ پس اسلامی نظام میں اشخاص اور گروہوں کے لئے ترغیب و مخالفت کی مہم میں ملازمین کا شریک ہونا جائز نہیں قرار دیا جا سکتا، نہ ان کے لئے کسی کا حامیانہ یا مخالفانہ تعارف کرانا ہی درست ہو سکتا ہے۔ وہ دوسروں کے سامنے اعلان کئے بغیر جس کے حق میں چاہیں گے، اپنا ووٹ خاموشی سے استعمال کر سکیں گے۔

پس اسلام کے لئے زندگیاں وقف کرنے والے ملازمین کے لئے تو صحیح روش یہی ہو سکتی ہے۔ رہے اسلام سے آزاد ہو کر زندگیاں گذارنے والے، تو کون نہیں جانتا کہ ضابطہ کی نمائشی پابندیوں کے پس پردہ یہ لوگ کیا کیا کچھ کرتے رہے ہیں اور آئندہ کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے ہمارا کوئی مطالبہ نہیں!

بے پردگی کا طوفان اور تحریک اسلامی

سوال:- میں آپ کی تحریک کا طریقِ کار معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ ضرور تشفی بخش جواب دیں گے۔

پاکستان زنانہ مسلم لیگ کی جدوجہد تو ان چند باتوں پر ختم ہے کہ پاکستان بھر کی عورتیں بے حجاب سڑکوں پر چلتی پھرتی نظر آئیں، زنانہ نیشنل گارڈ Womens National Gaurd میں بھرتی ہو کر اسلام کی آبرو کو چار چاند لگائیں، میلاد النبیؐ۔ یوم وفات قائد اعظم یا اسی طرح کی سوشل تقریبات میں پورے ہتھیاروں سے مزین ہو کر شہر بھر کے آوارہ گرد حضرات کو جائے تقریب کے اردگرد طواف پر لگائیں، یا سینما بازاروں میں کھل کھیلیں!

آپ حضرات زندگی کے ہر گوشے میں نظام اسلامی کے حدود جاری کرنے کے داعی ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کمیونزم کے خلاف اپنی جنگ کے ساتھ ساتھ آپ نے بے پردگی اور بے حیائی کے اس بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لئے اب تک کیا کیا ہے؟ یہ تو جناب بھی تسلیم کریں گے کہ صرف اجتماع تو اس بیماری کا علاج نہیں ہو سکتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی فرق ہوا نا کہ وہ بے پردہ اکٹھی ہو کر شور مچاتی

ہیں اور یہ محترم بہنیں با پردہ چند گھٹی دبی آوازیں بلند کر دیتی ہیں۔

میری مخلصانہ استدعا ہے کہ اپنی جماعت کی فاتی و کارکن خواتین کے زیر اہتمام عورتوں میں بھی اپنا پیغام پہنچائیے۔ اور نرسنگ وغیرہ کے اداروں کھول کر اصحاب اقتدار کو دکھا دیجئے کہ پردہ میں رہ کر بھی بمیہ وام عمارہ اور بنت خولہ کی روایات زندہ کی جا سکتی ہیں۔

امید کہ آپ میری گذارشات پر سکون قلب و دماغ کے ساتھ غور فرما کر جواب دیں گے !

جواب :۔ صورت واقعہ یہ نہیں ہے کہ ہم بے پردگی کے اس طوفان کی خطرناکیوں کا کوئی ہلکا اندازہ Under Estimate کر رہے ہیں جیسے وہ مٹھی بھر مغرب پرست اصحاب بپا کر رہے ہیں جو اپنے نظریات کے مطابق ایک ترقی پسندانہ زندگی با آرام گذارنے کے لئے پوری قوم کو اسی رنگ میں رنگنے کے درپے ہیں جس میں انگریزی تہذیب نے انہیں رنگ دیا ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ پردے کا نظام تہ و بالا کر دینے اور خاندان کی بنیادیں کھوکھلی کر دینے کے بعد اسلام دشمن طاقتوں کے لئے فسق و فجور کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس وقت ہمارے خدام اسلام نے معاشرتی زندگی کی ان آخری عقبی پناہ گاہوں پر براہ راست حملہ (Direct Attack) شروع کر دیا ہے جن میں اسلامی زندگی کی کچھ نہ کچھ قدریں (Values) محفوظ چلی آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہم دانستہ اپنی جدوجہد میں کوئی کوتاہی کرنا نہیں چاہتے۔

لیکن ہماری اصل مشکل یہ ہے کہ اب جس محاذ پر حملہ کیا گیا ہے اس پر مدافعت کا اصل فرض خود ہی ہماری خواتین ہی ادا کر سکتی ہیں۔ لیکن خواتین کا ۹۵ فیصدی حصہ وہ ہے جو جہالت اور جمود کی حالت میں مبتلا چلا آ رہا ہے۔ اس ۹۵ فیصد حصے میں اگر اسلام سے کوئی عقیدت ہے اور اگر پردہ واسی کی روایات سے کوئی وابستگی ہے تو وہ محض بطور عادت ہے۔ ایسی عقیدت و وابستگی کسی کشمکش کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ رہا بقیہ ۵ فیصدی حصہ تو اس میں سے ایک بڑی تعداد وہ ہے جو آسانی سے ہمارے خدام اسلام کی آلۂ کار بنتی جا رہی ہے۔ کیونکہ یہ حضرات اس جنتِ تہذیب کے رضوان ہیں جس میں جلسے اور نعرے ہیں، استقبال اور جلوس ہیں، ناچ کی محفلیں اور گانے کی مجلسیں ہیں، مینا بازار اور کنسرٹ ہیں، پریڈیں اور کرتب ہیں، نوکریاں اور تنخواہیں ہیں، غیر ملکی سفر اور سیاحتیں ہیں، شہرت اور ناموری ہے، عیاشی اور تفریحات ہیں، بازار گردیاں اور چمن آرائیاں ہیں، اور وہ سارے سامان

ہیں جو قوم کی بچیوں کا دل بہلا سکتے ہیں۔

باقی اسلامی زندگی کی حمایت کا جذبہ جن خواتین میں کارفرما ہے، اُن میں سے کچھ وہ ہیں جو منظم ہو کر کام کرنے کا دل گردہ نہیں رکھتیں، اور صرف جذبات کے زور سے کام لینا چاہتی ہیں۔ آخر میں ایک مختصر تعداد ان خواتین کی رہ جاتی ہے جو اسلام کو شعوری طور پر اپنائیں اور پھر منظم طریق سے دیرپا کام کر سکیں۔ بس خواتین کے حلقے میں تحریک اسلامی کا کام ایسی ہی خواتین کے ذریعے چل رہا ہے۔

ان کے سامنے اب تک جو پروگرام رہا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے ذہن و عمل کی تعمیرِ جدید کریں، خاندانی ماحول کو درست کریں، بچوں کی سیرتیں اسلام کے سانچے میں ڈھالیں، دوسری خواتین تک دعوت پہنچائیں اور اسلام کی خدمت کرنے میں مردوں کی رفاقت کا حق ادا کریں۔

رہے وہ سوشل کام جن کا حوالہ آپ نے دیا ہے، وہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہر مقام پر خواتین ورکرز کی ایک اچھی خاصی تعداد منظم کام کرنے کے لئے بہم پہنچ جائے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا، بہر حال ابتدائی کام جاری ہے اور اس کے نتیجے میں توقع ہے کہ آگے چل کر خواتین نئی ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لے سکیں گی۔

آپ کے دوسرے دو سوالات جن کو شائع نہیں کیا جا رہا، ان کے جوابات مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) ایک پردہ دار عورت بے پردہ عورتوں کے حلقوں یا ان کی مجلسوں میں محض ایک داعیۂ اسلام کی حیثیت کے ساتھ بہر حال جا سکتی ہے اور ان تک اپنا پیغام پہنچا سکتی ہے، بشرطیکہ خود اسے کسی فتنے میں پڑنے کا اندیشہ نہ ہو اور اسے کسی امرِ غیر مشروع میں تعاون نہ کرنا پڑے۔ محض کسی مجمع میں جا کر اپنی دعوت پیش کرنے کو "اشتراکِ عمل" نہیں کہا جا سکتا۔

(۲) عورتوں کا کسی جگہ جمع ہو کے نماز ادا کر لینا اور نماز سے پہلے یا پیچھے ان میں سے کسی کا خطاب کر دینا جائز ہے، اس قسم کی مثالیں قرونِ اولیٰ میں بھی عمل میں آئی ہیں، لیکن خواتین کی اس طرح کی اجتماعی نمازوں میں اصطلاحی قسم کی "امامت و خطابت" کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

واضح رہے کہ اس طرح کے معاملات کا تعلق عقیدہ کے اختلافات سے نہیں، بلکہ فقہی مسلک کے اختلافات

سے ہے۔ لہٰذا ایسے موقعوں پر یہ کہنا یا سوچنا صحیح نہیں ہوتا کہ فلاں کا عقیدہ محلِ نظر ہے۔

نئی کتابیں

اشتراکیت اور نظام اسلام

تالیف

محمد مظہر الدین صدیقی صاحب

"ہیگل، مارکس اور نظام اسلام" کا تیسرا ایڈیشن

بہت سے اضافوں کے ساتھ

ضخامت ۴۰۰ صفحات

قیمت چار روپے آٹھ آنہ

اشتراکیت اور اسلام

تالیف

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی

اشتراکیت پر علمی تنقید۔ اسلام کے نظام معاشی کی تشریح

دوسرا ایڈیشن

قیمت دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

سرورق مطبوعہ رہبر پریس لاہور